Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مارچ 1961ء

نیک آدمی کی پہچان

حضرت عمرؓ کے پاس ایک دفعہ ایک شخص گواہ کی حیثیت میں آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ کسی ایسے شخص کو لاؤ جو تمہیں جانتا ہو۔ چنانچہ وہ ایک شخص کو بلا لایا جس نے آ کر اس کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار کیا۔ آپ نے اس سے دریافت کیا "کیا تم اس کے قریبی پڑوسی ہو اور اسکی اندر باہر کی زندگی سے اچھی طرح واقف ہو"۔ اس نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے کہا "تو پھر کیا تم اس کے ساتھ سفر میں وہ چکے ہو، کہ سفر میں کسی کی اخلاقی حالت کا بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے"۔ اس کا جواب بھی نفی میں تھا۔ آپ نے فرمایا "کیا تم نے اس کے ساتھ کبھی درہم و دینار کا معاملہ کیا ہے، کیونکہ اس معاملہ میں انسان کے ورع و تقویٰ کی حقیقت کھل جاتی ہے"۔ اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ اب آپ نے فرمایا "تب میرا خیال ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے قرآن پڑھتے، کبھی سر جھکاتے اور کبھی اوپر اٹھاتے دیکھا ہے"۔ اس نے اقرار کیا۔ آپ نے کہا "چلے جاؤ۔ تم اس کو خاک نہیں جانتے"۔ اور اس آدمی کو حکم دیا کہ پھر جائے اور کسی ایسے آدمی کو لائے جو اسے واقعی جانتا ہو۔

(بحوالہ "اسلام کا نظام عدل" از سید قطب مصری)۔

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک
ہندوپاکستان سے سالانہ:۔ آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ:۔ ۱۲ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوپاکستان سے
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر ۴۵۰۰۵
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

جلد ۱۴ | مارچ سنہ ۱۹۶۱ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

لمعات		۲
قابلِ توجہ		۱۰
روزے کا مقصد	(محترم پرویز صاحب)	۱۳
دوسری طاہرہ بیٹی کا خط		۱۷
اسلامی قانون کی اصل بنیاد کیا ہے؟	(جسٹس محمد شفیع بالقابہ)	۲۵
رابطۂ باہمی		۴۱
قائدِ اعظم	(محترم صفدر سلیمی صاحب)	۴۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

موقر جریدہ المنبر (لائل پور) کی ۹ فروری ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں، صفحہ اول پر، جلی عنوان کے ساتھ، حسب ذیل عبرت آموز سطور شائع ہوئی ہیں۔

رومن کیتھولک عیسائیوں کا ایک اخبار "پراسیکٹر" کناڈا سے نکلتا ہے جس میں دنیا بھر کی عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کی تفصیل شائع ہوتی ہے۔ اس اخبار نے پاکستان میں عیسائیت کی کامیابی کے عنوان سے لکھا ہے کہ ۱۹۷۵ء میں یہاں کے آٹھ ہزار مسلمانوں نے عیسائیت قبول کی۔ اس سے پہلے پاکستان میں ۴۰ ہزار عیسائی تھے لیکن اب ان کی تعداد دو لاکھ اٹھاسی ہزار تین سو باسٹھ ہے۔

عالمی ادارے کی فراہم کردہ تفصیلات کے مطابق پاکستان میں (۳۲۳) پادری (۲۰۷) مرد اور عورتیں بطور مبلغ کام کر رہے ہیں۔ (۷۷۳) مدرسے ہیں جو تعلیم کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ ان مدارس میں (۶۰۲۴۳) طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ (۷۲) عیسائی ادارے ہسپتالوں وغیرہ کی صورت میں عیسائیت کے لئے زمین ہموار کرتے ہیں (۸۷) مذہبی مراکز ہیں جہاں عوام کو عیسائی بنایا جاتا ہے۔

صحیح صورت حال سمجھنے کے لئے یہ بھی معلوم رہے کہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں پاکستانی علاقوں میں صرف گیارہ ہزار عیسائی تھے جو بالعموم اچھوتوں میں سے آئے تھے۔ لیکن اب "پراسیکٹر" کی روایت کے مطابق دو لاکھ اٹھاسی ہزار ۳۶۲ افراد عیسائیت کو قبول کئے ہوئے ہیں۔

ملہ یہی اعداد و شمار محترم محمد جمیل صاحب نے اپنے مقالہ میں پیش کئے ہیں جس کا اردو ترجمہ، ماہنامہ ترجمان القرآن کی فروری ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ دو سال قبل، مسٹر انتھنی ڈی سوزا نے، جو پاکستانی عیسائیوں کے نمائندہ اور ایک

(باقی صفحہ ۵ پر دیکھئے)

اعداد و شمار کی یہ خوفناک تفصیل ہمارے سامنے اس حالت میں آتی ہے جب کہ کراچی سے پشاور اور لاہور سے ڈھاکہ تک کئی سو دینی مدارس ہیں جن میں ہزاروں طلبا اور سینکڑوں مدرس دینی علوم کو پڑھنے پڑھانے میں مصروف ہیں اور اس ملک میں ہزاروں علماء اور واعظ ایسے ہیں جو "تبلیغ" کو ہی ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں۔ ایک طرف یہ بھاری بھرکم تعداد اور دوسری جانب حالت یہ ہے کہ اس ملک کے آٹھ ہزار مسلمان ایک ہی سال میں مرتد ہو جاتے ہیں۔

آزادی سے پہلے ہمارے احساسات کا یہ عالم تھا کہ اگر ایک شخص مرتد ہو جاتا تھا تو پشاور سے راس کماری تک ہیجان کی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن آج ہم آٹھ کروڑ مسلمان زندہ ہیں، سینکڑوں اخبارات و رسائل اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کے لئے وقف ہیں اور یہاں سے وہاں تک اسلام کے حق میں جوش و خروش کے مظاہرے آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور کان سن رہے ہیں کہ صرف ایک سال میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آٹھ ہزار امتی مرتد ہو گئے اور ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ہماری نئی نسل عیسائیت کا لقمہ بن رہی ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ کیا عیسائیت اسلام سے زیادہ سائینٹفک ہے؟ کیا ایک عامی شخص توحید کے واضح اور نکھرے ہوئے تصور کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اس کا ذہن تثلیث کی بھول بھلیوں کو زیادہ آسانی سے سمجھ لیتا ہے؟ — نہیں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں۔ اصل سبب اس الم انگیز سانحہ کا یہ ہے کہ ہمارے علماء نے اپنا فرض صرف اس چیز کو قرار دے لیا ہے کہ جو لوگ مسجدوں میں آ جاتے ہیں انھیں اپنے اپنے فرقے کے مخصوص مسائل سنا دیئے جائیں۔ رہے وہ کروڑوں مسلمان جو اسلام کے مبادیات سے بھی ناواقف ہیں اور وہ جو غیر اسلامی افکار و خیالات کی زد میں رہتے ہیں تو ان سے ہمارے علماء کو کوئی سروکار نہیں۔

اگر ہمارے یہ قابلِ احترام حاملانِ دین اس بات پر یقین رکھتے ہیں۔ کہ خدائے ذوالجلال کے حضور انھیں اس ارتداد کے بارے میں جواب دہ ہونا ہے تو انھیں اس کے لئے فکر مند ہونا چاہیئے۔ اور اسلام کے اس تصورِ تبلیغ و دعوت کو اپنانا چاہیئے جو بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ ۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ أَنْ لَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ اور مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ کے نور میں الہیّہ میں پیش کیا گیا ہے۔

علماء کی خدمت میں اس گذارش کے بعد حکومت پاکستان سے استدعا ہے کہ وہ بھی اپنے فرائض کو سمجھے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۴۲) ذمہ دار سرکاری ملازم ہیں، اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ عیسائی اقلیت آج صرف بڑے شہروں اور قصبوں ہی میں سرگرم کار نہیں ہے بلکہ پورے ملک کے دیہات میں بلکہ جھونپڑوں تک میں عیسائی تبلیغی ڈاکٹر، نرسیں اور تعاون والے موجود ہیں اور مغربی پاکستان میں عیسائیو کے پورے کے پورے گاؤں وجود میں آ چکے ہیں۔

> کرے، ایک ایسے ملک میں جس کی اساس و بنیاد اسلام کے اصولوں پر رکھی گئی ہو اور جسے کو ہم ایک ایسا تجربہ گاہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں جس میں اسلامی نظام کو کامیاب بنایا جائے گا۔ اگر اس میں فتنۂ ارتداد اس طرح تباہی مچائے کہ ایک سال میں آٹھ ہزار فرزندانِ توحید عیسائیت کی آغوش میں چلے جائیں، تو اس ملک کی سالمیت کس طرح محفوظ رہ سکتی ہے، اور اسے اسلام کے لئے تجربہ گاہ بنانے کا خواب کیسے شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے؟

ہم اس مقالہ کے ان حصوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے جن میں محض جذبات سے اپیل کی گئی ہے، صورتِ حالات کا واقعاتی نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ مذہبی آزادی کے بنیادی اصول کے پیشِ نظر، پاکستان میں کسی غیر مسلم فرد یا ادارہ کو اس بات سے روکا نہیں جا سکتا کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کرے۔ نہ ہی کسی مسلمان کو اس سے باز رکھا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی اور مذہب اختیار کر لے۔ (طلوعِ اسلام میں اس نکتہ پر تفصیلی بحث آ چکی ہے کہ یہ عقیدہ کہ "مرتد کی سزا قتل ہے" کس طرح غیر قرآنی ہے)۔ لیکن اس میں دو ایک امور ایسے ہیں جن کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ عیسائی مشنریوں کی پشت پر بڑی بڑی صاحبِ دولت و اقتدار مملکتیں ہیں۔ ان مملکتوں کی پشت پناہی کی بناء پر عیسائیت کو مذہبی صداقت کے زور پر نہیں، بلکہ دولت اور وجاہت کے سہاروں پر پھیلایا جاتا ہے، اور مقصود اس سے "مسیح کی منادی" نہیں بلکہ ان مملکتوں کے سیاسی مصالح ہیں۔ جن لوگوں کو یہاں عیسائی بنایا جاتا ہے آپ ان سے پوچھ کر دیکھئے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا نکلے جو یہ بتا سکے کہ اسلام میں وہ کونسی خرابیاں تھیں جن کی بنا پر اس نے اس دین کو چھوڑا، اور عیسائیت میں وہ کونسی صداقتیں ہیں جن کی وجہ سے اس نے اسے اختیار کیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان لوگوں کی تبدیلیٔ مذہب نتیجہ ہوتی ہے اس بیش بہا دولت کا جسے پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اور ان مخصوص طرق و ذرائع کا جنہیں اس مقصد کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ "مذہبی آزادی کے حق" کا ناجائز استعمال (EXPLOITATION) ہے جسے کسی صورت میں بھی روا نہیں رکھا جا سکتا۔

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلہ میں جو لٹریچر پھیلایا جاتا ہے اس میں عیسائیت کی حمایت سے کہیں زیادہ اسلام کی مخالفت کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ مثلاً اس وقت ہمارے سامنے دو چھوٹے چھوٹے (تین تین ورقی) پمفلٹ ہیں جو "مسیحی اشاعت خانہ۔ ۳۶ فیروز پور روڈ۔ لاہور" کی طرف سے شائع کئے گئے ہیں۔ عیسائیت کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ

(۱) ہر انسان پیدائشی گنہگار ہوتا ہے۔

(۲) انسان کی نجات کسی ایسی ہستی کے ذریعے ہو سکتی ہے جو گناہگار نہ ہو۔

(۳) یہ ہستی حضرت مسیح کی تھی جس نے صلیب پر جان دے کر انسانی گناہوں کا کفارہ دے دیا۔ لہٰذا نجات اسی

انسان کی ہو سکتی ہے جو حضرت مسیح کے کفارہ پر ایمان لائے۔

مذکورہ بالا پمفلٹوں میں سے ایک کا عنوان ہے "بے گناہ نبی" اور دوسرے کا "گناہ کبیرہ" اول الذکر پمفلٹ میں، قرآن کریم کی مختلف آیات کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے

پس ہم نے از روئے قرآن ثابت کر دیا ہے کہ صفی اللہ (آدم)۔ نبی اللہ (نوح)، خلیل اللہ (ابراہیم)۔ کلیم اللہ (موسیٰ) اور زبور نویس (حضرت داؤد) سب کے سب، کسی نہ کسی وقت گناہ کے مرتکب ہوئے اور یوں بے گناہ کہلانے کے حقدار نہیں ٹھہرتے۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق دوسرے پمفلٹ میں خصوصیت سے لکھا ہے کہ

ہم حیرت زدہ ہو جاتے ہیں کہ باوجود مشرک کے گھناؤنا اور ناقابل معافی ہونے کے، اہل اسلام حضرت ابراہیم کو بڑا بزرگ بلکہ خلیل اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں حالانکہ سورۃ الانعام کی ۷۵ تا ۷۹ آیات صریحاً گواہی دیتی ہیں کہ کسی وقت حضرت ابراہیم تھے مشرک۔ پس ذی ہوش تو پوچھنے پر مجبور ہے کہ حضرت ابراہیم ناقابل غفر گناہ کے مرتکب ہوئے تو وہ کیسے معافی پا کر خلیل اللہ کے لقب سے نامزد کئے گئے۔

اس کے بعد، پمفلٹ میں لکھا ہے۔

اصل میں اس تحریر کا بڑا مقصد یہ ہے کہ پڑھنے والے کو پوری آگاہی ہو جائے کہ محض نبیوں سے ہم نجات حاصل کرنے کی پناہ نہیں لے سکتے جبکہ انبیاء خود گناہ کا شکار ہو بیٹھے ہیں۔ وہ آدمی جو خود دلدل میں پھنسا ہوا ہے اس دلدل میں گرنے والوں کی مدد نہیں کر سکتا۔ ایسی خطرناک جگہ سے بچنے کا ایک ہی وسیلہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی دوسرا آدمی جو اس میں مبتلا نہ ہو مصیبت زدہ کی مدد کرے۔ اسی طرح گناہ کی دلدل سے بھی بچنے کے لئے ایسے شخص کی ہمیں ضرورت ہے جو خود اس مصیبت کا شکار نہ ہو۔ لیکن کیا اس قسم کا شخص ہمیں کہیں مل سکتا ہے جو اس لازمی شرط کو پورا کر سکے۔؟

اس کے بعد لکھا ہے۔

خدا تعالیٰ کا ہزار شکر ہے کہ اس کی طرف سے ایک ایسا بزرگ موجود ہے، جو کتاب اسلام میں ہر جگہ بے گناہ بتایا گیا ہے۔ کہیں بھی اس کا کوئی گناہ مذکور نہیں حالانکہ بخلاف اس کے قرآن شریف اور بائیبل مقدس دونوں میں دیگر گناہوں کا ذکر بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس شخص کو خداوند یسوع مسیح کہتے ہیں۔

آخر میں لکھا ہے۔

حق شناس آدمی ضرور سمجھ لے گا کہ اس کو ایسے نجات دہندہ کی ضرورت ہے جو گناہ سے سراسر پاک ہو

> اور جو اس وقت قبر میں نہیں بلکہ زندہ ہو۔ یوں وہ برگشتہ انسان کے لئے کچھ کر سکتا ہے۔ آپ کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے ہم آپ کے سامنے خداوند یسوع مسیح کو پیش کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہی واحد شخص ہے جو گناہ آلودہ انسان کو گناہ کی دلدل سے نکال کر ابدی خوشی میں داخل کر سکتا ہے۔

آپ ان اقتباسات کو غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ ان میں عیسائیت کی تائید سے کہیں زیادہ اسلام کی تنقیص پائی جاتی ہے۔ ان میں اتنی احتیاط ضرور برتی گئی ہے کہ (معاذ اللہ) "گناہگار نبیوں کی فہرست میں" نبی اکرمؐ کا اسم گرامی بالتصریح درج نہیں کیا گیا لیکن بالواسطہ حضورؐ کو بھی اس زمرہ میں شامل کر لیا گیا ہے جب کہا گیا ہے کہ

> قرآن شریف اور بائیبل مقدس دونوں میں (حضرت مسیح کے علاوہ) دیگر انبیاء کے گناہوں کا ذکر بکثرت پایا جاتا ہے۔

اور یہ کہ

> خداوند یسوع مسیح ہی وہ واحد شخص ہے جو گناہ آلودہ انسان کو گناہ کے دلدل سے نکال کر ابدی خوشی میں داخل کر سکتا ہے۔

اگر (بفرضِ محال) یہ مان بھی لیا جائے کہ اس فہرست میں نبی اکرمؐ کو شامل نہیں کیا گیا، تو بھی اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ ان تمام حضرات انبیاء کرام کی عزت و توقیر مسلمانوں کے لئے جزوِ ایمان ہے۔ ایک شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک، نبی اکرمؐ کی نبوت کے ساتھ، ان تمام حضرات انبیاء کرام کی نبوت پر ایمان نہ لائے اور یہ عقیدہ نہ رکھے کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲/۲۸۵) "ہم خدا کے رسولوں میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے۔"
سوال یہ ہے کہ کیا ایک ایسے ملک میں جس میں اس ایمان کی حامل قوم اس کثرت سے آباد ہو، اس قسم کے خیالات کی نشر و اشاعت، مذہبی آزادی میں داخل ہوگی یا مذہبی دلآزاری میں؟ مذہبی نقطۂ نگاہ کو چھوڑئیے۔ کیا خالص قانونی گوشۂ نظر سے بھی اس قسم کی مساعی کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔؟

جن مقالہ نگاران کا شروع میں ذکر کیا گیا ہے وہ صرف اس بات سے پریشان ہوئے ہیں کہ ایک سال میں آٹھ ہزار پاکستانی مسلمان عیسائیت کی آغوش میں چلے گئے۔ ان کی نگاہ ان ہزارہا نوجوان (لڑکے اور لڑکیوں) کی طرف نہیں گئی جو اگرچہ کھلے بندوں عیسائیت کی آغوش میں چلے جانے کا اعلان نہیں کرتے، لیکن جو اسلام سے اس شخص سے بھی زیادہ برگشتہ اور متنفر ہوتے ہیں جو کھلے بندوں اسلام کو ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ہمارے وہ نونہال ہیں جنہیں ہم منتیں اور خوشامدیں کر کے، مشنری اسکولوں اور کالجوں میں داخل کراتے ہیں۔ ہزارہا روپیہ ان کی تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔ اور جب وہ ان درسگاہوں سے نکلتے ہیں تو ان کے سینے اسلام کے متعلق نہ صرف

شکوک و شبہات، بلکہ اس کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات سے شعلہ گیر ہوتے ہیں۔ ان درسگاہوں میں، اس مقصد کے حصول کے لئے بڑے لطیف (Subtle) طریق اختیار کئے جاتے ہیں۔ اول تو ان میں بائیبل کی تعلیم ضرور دی جاتی ہے۔ اس پیریڈ میں ہوتا یہ ہے کہ بائیبل مقدس سامنے رکھی ہے اور لیکچر اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف دیا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ پہلی جماعت سے آخر تک متواتر جاری رہتا ہے بائیبل کے علاوہ، دوسرے مضامین پڑھانے میں بھی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام کے خلاف شک و شبہ کی کوئی نہ کوئی پھانس طلباء کے دل میں پیوست کر دی جائے۔ لڑکوں کے مقابلہ میں، لڑکیوں پر ان کی توجہ زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ ایک لڑکی کے خیالات بدل دینے سے، کئی خاندان متاثر کر دیئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے جو لڑکیاں ہوسٹل میں رہتی ہیں، ان کے گرد ایک ایسی فضا پیدا کر دی جاتی ہے جس میں اس پراپیگنڈہ کے جراثیم بُری طرح پھیلے رہتے ہیں۔ ان سے بچنا ان کے لئے بڑا دشوار ہوتا ہے۔ ایک تو انہیں مذہب کے متعلق اتنی واقفیت نہیں ہوتی جس سے یہ اس قسم کے اعتراضات کا جواب دے سکیں، لیکن ان میں سے اگر کوئی اس کی جرأت بھی کرے، تو اس کا جو حشر ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حالات یہ ہیں تو مسلمان ماں باپ اپنے بچوں کو ان درسگاہوں میں بھیجتے کیوں ہیں، درانحالیکہ ان میں مقابلۃً خرچ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان درسگاہوں میں تعلیم اور نظم و نسق کا معیار دوسری درسگاہوں سے نسبتاً بلند ہوتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ پھر اس کا علاج کیا ہے؟ علاج اس کا یہ ہے کہ آپ اپنے ہاں کی درسگاہوں میں تعلیم اور نظم و نسق کا معیار بلند کیجئے اس طرح عیسائی درسگاہوں کو یا تو اپنے ہاں عیسائیت کی جبری تبلیغ بند کرنی پڑے گی اور یا خود ان درسگاہوں کو ختم کرنا پڑے گا۔

اس سے کمتر درجہ پر علاج یہ ہے کہ حکومت ان درسگاہوں کو روک دے کہ وہ غیر عیسائی بچوں کو عیسائیت کی تعلیم نہ دیں۔ مسئلہ "بنیادی حقوق انسانیت" (Fundamental Human Rights) کی ایک شق یہ بھی ہے (اور یہ شق ۱۹۵۶ء کے دستور پاکستان میں بھی موجود تھی) کہ کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ کسی درسگاہ میں، اپنے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب کی تعلیم حاصل کرے یا مذہبی تقریب یا پرستش میں حصہ لے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، یہ علاج بسبیل تنزل ہے۔ اس لئے کہ درسگاہوں میں خیالات کو متاثر کرنے کے ہزار طریقے ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو قانون کی زد میں آ ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا اس مشکل کا اصلی حل وہی ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ یعنی ہم اپنے ہاں بہترین درسگاہیں قائم کریں۔

لیکن یہ تو اس مسئلہ کا محض منفی پہلو (Negative Aspect) ہے۔ اس سے ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے بچے عیسائیت کے اثرات سے محفوظ رہیں۔ ان کے دل میں اسلام کے خلاف جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں اس سے ان کا ازالہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ شکوک و شبہات مشنری درسگاہوں تک محدود نہیں۔

ہماری اپنی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی بھی یہی حالت ہے۔ اس کی وجہ وہ ناقص، بلکہ مضر تعلیم ہے جو "اسلامیات" کے نام سے ان بچوں کو دی جاتی ہے۔ یہ "اسلامیات" پرانے "دینیات" ہی کا ماڈرن لیبل ہے۔ جن طالب علموں نے اس "اسلامیات" کو پڑھا ہے۔ ان سے مل کر ہمارا عام اندازہ یہی ہے کہ یہ "اسلامیات" اسلام کو سمجھنے میں بڑی رکاوٹ کا موجب ہے اور بڑی حد تک ان نوجوانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کا باعث۔

ان حالات کے ماتحت، زیرِ نظر مسئلہ کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کو قرآنی خطوط کے مطابق از سرِ نو مرتب کریں اور اپنے بچوں اور نوجوانوں کے قلب و نگاہ کی تعمیر اس طرح کریں کہ وہ اسلام کی افضلیت اور فوقیت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھیں۔ پھر انہیں نہ عیسائی مشنریوں کی آتشِ خاموش کی طرف سے کوئی خطرہ ہوگا اور نہ کمیونزم کے شعلۂ جوالہ کی طرف سے کوئی خدشہ۔

باقی رہا یہ سوال کہ علماء حضرات عیسائی مشنریوں کے پراپیگنڈے کا جواب دے کر فریضۂ تبلیغ ادا کریں، تو بظاہر یہ تجویز بڑی معقول نظر آتی ہے، لیکن یہ چیز ان علمائے کرام کے بس کی بات نہیں۔ جہاں تک قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کا تعلق ہے، ان کے دل میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کا ازالہ تو ایک طرف، ہمارا قدامت پرست طبقہ ان شکوک کی لِم تک کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے لئے ایک طرف عصرِ حاضر کے علوم سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے اور دوسری طرف اسلام کو، دورِ حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر سمجھنا، لاینفک۔ علماء حضرات کے نزدیک یہ دونوں چیزیں شجرِ ممنوعہ ہیں۔ اب رہے عوام، تو ان کی سطح پر اسلام کے خلاف جس قسم کے اعتراضات عیسائی مشنری کرتے ہیں ان کی تائید خود اس لٹریچر سے ہو جاتی ہے جسے ہمارے علماء حضرات دین میں سند مانتے ہیں۔ مثلاً اسی ایک اعتراض کو لیجئے جو ان پمفلٹوں میں پیش کیا گیا ہے جن کے اقتباسات ہم نے شروع میں دیئے ہیں۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ مسلمان انبیاء کرام کو گنہگار مانتے ہیں، اور جو خود گنہگار ہو وہ دوسرے گنہگاروں کی نجات کا باعث کس طرح بن سکتا ہے۔ یہ ہے ان کا اعتراض۔ اب دیکھئے کہ خود ہمارے "مستند لٹریچر" میں اس اعتراض کی تائید کس طرح ملتی ہے۔ بخاری شریف (کتاب التفسیر) میں یہ روایت موجود ہے کہ رسول خدا صلعم نے فرمایا کہ

> قیامت کے دن سب مسلمان جمع ہو کر مشورہ کریں گے کہ آج کے دن ہم کسی کو اپنا شفیع بنائیں۔ اور آدمؑ کے پاس آئیں گے۔ اور کہیں گے کہ آپ سب کے باپ ہیں۔ آپ کو اللہ نے ملائکہ سے سجدہ کرایا ہے اور آپ کو تمام نام سکھائے ہیں۔ آپ ہماری شفاعت کریں تاکہ ہم آج اس جگہ کی تکلیف سے راحت پائیں۔ وہ کہیں گے آج میں اس قابل نہیں۔ اور اپنا گناہ یاد کریں گے (خلافِ حکم درخت کا پھل کھا لیا تھا) اور اللہ سے شرمائیں گے اور کہیں گے کہ تم نوحؑ کے پاس جاؤ۔ ان کو اللہ نے سب سے پہلا نبی بنا کر زمین پر بھیجا تھا۔ سب آدمی ان کے پاس آئیں گے۔ وہ کہیں گے۔ آج میں اس قابل نہیں۔ اور اپنا گناہ یاد کر کے شرمائیں گے۔

اور کہیں گے۔ تم ابراہیمؑ خلیل اللہ کے پاس جاؤ۔ سب کے سب ان کے پاس جائیں گے اور یہ بھی ایسا ہی کہیں گے۔ اور کہیں گے تم موسیٰؑ کے پاس جاؤ۔ اللہ نے ان سے باتیں کی ہیں اور توراۃ عطا فرمائی ہے۔ وہ ان کے پاس آئیں گے۔ یہ بھی کہیں گے کہ میں آج تمھارا شفیع نہیں ہو سکتا۔ اور اپنا گناہ یاد کر کے اللہ سے شرمائیں گے۔ اور کہیں گے تم عیسیٰؑ کے پاس جاؤ۔ وہ رسول اللہ۔ کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ جب ان کے پاس آئیں گے۔ یہ بھی ایسے ہی کہہ دیں گے اور کہہ دیں گے کہ محمدؐ کے پاس جاؤ جس کے اللہ نے اگلے پچھلے سارے گناہ بخش دیئے ہیں۔ وہ اس وقت میرے پاس آئیں گے۔ میں انھیں اللہ کے پاس بخشوانے لے جاؤں گا۔

(ترجمہ شائع کردہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب۔ جلد دوم۔ صفحہ ۹۱۹)

آپ غور کیجئے کہ اس روایت کی رو سے

(i) تمام انبیاء کرامؑ کو (معاذ اللہ) گنہگار ٹھہرایا گیا ہے۔ ایسے گنہگار کہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے خدا سے شرمائیں گے۔

(ii) حضرت عیسیٰؑ کے متعلق بھی کہا تو یہی گیا ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کہیں گے لیکن ان کا وہ گناہ نہیں بتایا گیا جس کی وجہ سے وہ شرمائیں گے۔ اس لئے ان کے متعلق بات ایسی شدید نہیں بنی۔

(iii) خود نبی اکرمؐ کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ "اللہ نے ان کے اگلے پچھلے سارے گناہ بخش دیئے ہیں" یعنی (معاذ اللہ) گناہگار تو حضورؐ بھی تھے۔ ان کے گناہ اللہ نے بخش دیئے تھے۔

آپ غور کیجئے کہ جب اس روایت کو رسول اللہ کا ارشاد تسلیم کر لیا جائے تو آپ عیسائیوں کے اس اعتراض کا کیا جواب دے سکیں گے کہ مسلمانوں کو خود تسلیم ہے کہ تمام انبیائے کرام گناہگار تھے۔

یہ بات ہم نے محض بطور مثال بیان کی ہے، ورنہ غیر مسلموں کے بیشتر اعتراضات کی بنیاد اسی قسم کی (وضعی) روایات پر ہوتی ہے۔ باقی رہے ان کے اعتراضات قرآن پر۔ سو اگر قرآن کی تفسیر روایات کی رو سے نہ کی جائے تو کوئی اعتراض ایسا نہیں جس کا اطمینان بخش جواب قرآن سے نہ دیا جا سکے۔

بنابریں اسلام کے خلاف غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب وہی دے سکے گا جو اسلام کے لئے، صرف قرآن کریم کو بطور سند پیش کرے گا۔

یہ ہے اس مسئلہ کا بنیادی حل جسے ہمارے علماء حضرات کبھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

قابلِ توجّہ

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو

ہمیں، ویسٹ پاکستان پنشنرز ایسوسی ایشن (سنٹرل اینڈ پراونشل) لاہور، کی طرف سے کچھ دستاویزیں موصول ہوئی ہیں جن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس عالمگیر گرانی کے زمانے میں سرکاری پنشنرز کس عسرت میں زندگی بسر کرتے ہیں، اور یہ ایسوسی ایشن، صورتِ حالات کو بہتر بنانے میں کیا کچھ کر رہی ہے۔ ان کی مساعی بہرحال آئینی انداز کی ہیں (اور آئینی ملک میں مساعی ہوتی بھی آئینی انداز ہی کی چاہئیں)، لیکن، جہاں تک ہم دیکھ سکے ہیں، انہیں ابھی تک کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔

یوں تو، ہمارے ہاں کی ایک پرانی مثل کے مطابق، نوکری چاکری (ملازمت) ہی کو "نکھد" (خراب ترین) قرار دیا گیا ہے[1] لیکن بیچارے پنشنر کی حالت، ملازم کے مقابل میں اور بھی "نکھد" ہوتی ہے۔ آپ ذرا تصور میں لائیے اس منظر کو کہ ایک شخص، پچیس تیس سال کی مسلسل محنت کے بعد، ملازمت کے آخری زینہ تک جا پہنچا ہے۔ اس کا، اور اس کے متعلقین کا معیارِ زیست اس نسبت سے بلند ہو چکا ہے۔ زندگی کی آسائشیں میسر ہیں۔ رہنے کو سرکاری مکان (بعض اوقات بلا کرایہ اور دیگر حالات میں، محض برائے نام کرایہ پر) موجود ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے سرکاری انتظامات ہیں۔ طبی امداد مفت حاصل ہے۔ کہ اس کی ریٹائرمنٹ کا حکم نامہ موصول ہو جاتا ہے جو اس کی حسنِ کارکردگی کی سند ہوتا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ اس سے وہ ساری آسائشیں چھن جاتی ہیں۔ مکان سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ مفت طبی امداد ختم ہو جاتی ہے۔ الاؤنسز وغیرہ ختم ہو جاتے ہیں۔ اور سب سے بڑی چیز یہ کہ تنخواہ بھی نصف (اور بعض حالات میں اس سے بھی کم) رہ جاتی

[1] اتم کھیتی۔ مدھم بیوپار۔ نکھد چاکری۔

ہے۔ آپ سوچئے کہ عین اس وقت جب اسے (عمر کے آخری حصہ میں) زیادہ آسائشوں کی ضرورت تھی اس کا اس طرح ٹھوکر سے نیچے آگرنا، کس قدر استخواں شکنی کا موجب ہوتا ہے! قرآن کریم نے اس کی اس حالت کا نقشہ بڑے عبرت انگیز انداز سے کھینچا ہے جب فرمایا کہ

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَن تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ - لَهُ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ - وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ - وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ - فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ - كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ (۲/۲۶۶)

(ذرا سوچو کہ) ایک شخص ہے جس کے پاس کھجوروں اور انگوروں پر مشتمل (لہلہاتا) باغ ہے۔ اس میں سیرابی و شادابی کے لئے) نہریں بہ رہی ہیں۔ اس میں ہر قسم کے پھل پھول پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بوڑھا ہو جاتا ہے اور چھوٹی چھوٹی اولاد اس کے گرد جمع ہوتی ہے۔ کہ اتنے میں ایک جھلستی ہوئی آندھی چلتی ہے اور آن کی آن میں وہ باغ جل کر ویران ہو جاتا ہے۔

کیا تم میں سے کوئی بھی چاہے گا کہ اس کا یہ حشر ہو جائے!

اللہ ایسی ہی مثالوں کے پیرایہ میں تم پر حقیقت کی نشانیاں واضح کر دیتا ہے تاکہ تم غور و فکر سے کام لو۔

ایسا کون چاہے گا؟ لیکن وہ چاہے یا نہ چاہے، پنشنر کو یہ باغ چھوڑ کر، اپنے بال بچوں کے ساتھ ویرانے میں بسنا پڑتا ہے؛ پھر طرفہ تماشا یہ کہ جب اسے پنشن ملی تھی تو اس وقت روپے کا بیس سیر آٹا ملتا تھا۔ اب دو ہی سیر ملتا ہے۔ لیکن اس کی آمدنی (پنشن) کے روپے کے سوا روپیہ نہیں ہوتا ۔۔۔ بڑھاپا بڑھتا جاتا ہے۔ قوی کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ آسائشوں کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ اور اس کی آمدنی (ہوشربا گرانی کی وجہ سے) یوں سکڑتی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی پنشن والوں کی تو فاقوں تک نوبت آجاتی ہے۔ اور یہی وہ طبقہ ہے جو فوری توجہ کا محتاج ہے۔ ان بیچاروں کی عام طور پر حالت کیا ہوتی ہے، اس کی ایک جھلک دیکھنی ہو، تو کسی مہینے کی پہلی تاریخ کو خزانے کے دفتر کے سامنے جائیے اور دیکھئے کہ یہ سسکیاں، ہڈیاں آپ کو کیا کیا یاد دلاتی ہیں۔

اس صورت حالات کی بنیادی ذمہ دار وہ ذہنیت ہے جس کے مطابق انگریز نے سرکاری ملازمین کی تنخواہ، ان کی ضروریات کے مطابق نہیں، بلکہ اپنے پیمانوں کے مطابق مقرر کی۔ اس تنخواہ میں کسی کا گذارہ ہوتا ہے یا نہیں، اس سے اُسے کچھ واسطہ نہیں تھا۔ اور جب ملازمت کے دوران اس کا اس سے کچھ واسطہ نہیں تھا تو ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد (پنشنر کے لئے)، وہ اس سے اپنا واسطہ کیوں رکھتا؟ اس کا حقیقی حل وہی ہے جو

قرآن کریم نے تجویز کیا ہے۔ یعنی یہ نظام معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر فرد کو اس کی ضمانت دے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا، ہم ارباب حکومت سے پُر زور گزارش کریں گے کہ وہ اس بظاہر سفید پوش لیکن درحقیقت عریاں بدن طبقہ کی حالت بہتر بنانے کے لئے، بلا تاخیر ضروری اقدامات کریں تاکہ یہ ناسازگار حالات کے ستائے ہوئے اپنی زندگی کے آخری دن قدرے پرسکون گذار سکیں۔ ان کا حق قرآن نے یہ کہہ کر تسلیم کرایا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ

وَالْمَحْرُوْمِ (۷۰/۲۴)

یہ سائل (ضرورت مند) بھی ہیں اور محروم (کام کرنے کے ناقابل) بھی۔

ادارۂ طلوع اسلام کی مطبوعات

اور حسب ضرورت ہر قسم کی دیگر کتب کے لئے

ہماری خدمات حاصل کیجئے

مکمل فہرست کتب ایک کارڈ لکھ کر طلب فرمایئے

ناشران

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷-بی — شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

روزے کا مقصد

(پرویز)

(محترم پرویز صاحب کی تقریر جو ۱۹ فروری کی شام لاہور ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی۔)

قرآن کریم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جہاں کسی بات کا حکم دیتا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس حکم کی غرض و غایت کیا ہے۔ اس سے مقصود کیا ہے۔ اس پر عمل کرنے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے۔ روزے کے متعلق اس نے کہا کہ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ اے جماعتِ مومنین! جس طرح ان لوگوں پر جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں، روزہ فرض کیا گیا تھا، اسی طرح تم پر بھی فرض کر دیا گیا ہے۔ یہ ہے روزے کا حکم۔ اس کے بعد ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۲/۱۸۳) روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔ یہ ہے روزے کا مقصد۔

تقویٰ کا لفظ قرآن کریم کی ایک جامع اصطلاح ہے جس کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ لیکن اگر اسے دورِ حاضر کی زبان میں سمجھنا چاہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد ہے بلند ترین کیریکٹر۔ لہٰذا قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ تمہارے لئے روزے اس لئے ضروری قرار دیئے گئے ہیں کہ تم میں کیریکٹر پیدا ہو۔

سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کسے کہتے ہیں۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص کو سخت بھوک لگی ہے۔ اس کے سامنے نہایت عمدہ کھانا رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ لپک کر لقمہ اٹھاتا ہے۔ اسے منہ کے قریب لاتا ہے تو کوئی شخص اس کے کان میں کہتا ہے کہ اس کھانے میں زہر ملا ہوا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ اس لقمہ کو منہ میں ڈالے گا یا کھانے کی پلیٹ اٹھا کر باہر پھینک دے گا؟ ظاہر ہے کہ وہ اس کھانے کو کبھی نہیں کھائے گا۔ لیکن اس کے لئے یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے اس کھانے سے پرہیز کر کے کیریکٹر کا ثبوت دیا ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہیں گے کہ اس نے سوجھ سے کام لیا ہے۔ ایسے کھانے کو کوئی صاحبِ عقل و ہوش ہاتھ نہیں لگائے گا۔

اب اسی مثال میں یوں سمجھئے کہ جب وہ شخص لقمہ منہ میں ڈالنے لگتا ہے تو اُسے بتایا جاتا ہے کہ یہ کھانا ناجائز کمائی کا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اُس وقت بھی اس کا ردِ عمل وہی ہوگا جو پہلے ہوا تھا؟ اگر وہ اب بھی اُس کھانے سے اُسی طرح انکار کر دیتا ہے جس طرح اُس نے زہر آلود کھانے سے انکار کر دیا تھا تو اسے کیریکٹر کہیں گے۔ یعنی جائز اور ناجائز میں تمیز کرنا، کیریکٹر کا پہلا زینہ ہے۔ جائز اور ناجائز میں تمیز کرنا صرف انسان کا خاصہ ہے۔ حیوان نہ اس قسم کی تمیز کر سکتا ہے، نہ ہی اُسے اس کا کچھ احساس ہو سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیے کہ جائز اور ناجائز میں تمیز کرنا انسانیت کا تقاضا ہے۔

جہاں تک آدمی کی جسمانی زندگی کا تعلق ہے، اس میں اور دوسرے حیوانات میں کچھ فرق نہیں۔ دونوں کے لئے ایک جیسے طبیعی قوانین (PHYSICAL LAWS) مقرر ہیں۔ جن کے مطابق وہ زندہ رہتے اور بالآخر مر جاتے ہیں۔ یہ قوانین علم و عقل اور تجربات و مشاہدات کی رُو سے دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کی انسانی زندگی طبیعی قوانین کے تابع نہیں۔ اس کے لئے اور قسم کے قوانین ہیں۔ یہ قوانین خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے ملتے ہیں۔ یہی وہ قوانین ہیں جن کی رُو سے جائز اور ناجائز میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ اِن قوانین کو صحیح اور سچا سمجھنے کو ایمان کہتے ہیں۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ جو مثال پہلے بیان کی جا چکی ہے اس میں جب اُس شخص نے زہر آلود کھانے سے انکار کر دیا تھا تو اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ بات بالکل واضح ہے۔ ایک طرف اُس کی بھوک کا تقاضا تھا کہ کھانا کھا لیا جائے۔ دوسری طرف اُس کی جان کی سلامتی کا تقاضا تھا کہ اُسے نہ کھایا جائے۔ چونکہ اس کے نزدیک، بھوک کے مقابلہ میں جان زیادہ قیمتی تھی اس لئے اس نے زیادہ قیمتی چیز کو بچانے کے لئے اُس سے کم قیمت کی چیز کو قربان کر دیا۔

جب اُس سے کہا گیا کہ وہ کھانا ناجائز کمائی کا ہے تو اُس وقت بھی اُس کے سامنے دو تقاضے تھے۔ ایک اُس کے جسم کا تقاضا کہ بھوک مٹانے کے لئے کھانا کھا لیا جائے۔ اور دوسرا اس کی انسانیت یا ایمان کا تقاضا کہ جائز اور ناجائز میں تمیز کی جائے۔ اگر اُس کے نزدیک، جسم کے تقاضے کے مقابلے میں، ایمان کا تقاضا زیادہ قیمتی ہے تو وہ اُس کھانے سے پرہیز کریگا لیکن اگر وہ جسم کے تقاضے کو ایمان کے تقاضے پر ترجیح دیتا ہے تو وہ اُس کھانے سے ہاتھ نہیں روکے گا۔ لہٰذا، کیریکٹر کے معنی یہ ہوئے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور ایمان کے تقاضے میں ٹکراؤ ہو جائے۔ آن میں (TIE) پڑ جائے، تو جو شخص ایمان کے تقاضے کو جسم کے تقاضے پر ترجیح دیتا ہے وہ بلند کیریکٹر کا ثبوت دیتا ہے۔

روزہ انسان میں اس قسم کا کیریکٹر پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ روزہ رکھنے والا اپنے اوپر پابندی عائد کرتا ہے کہ وہ دن بھر کھانے پینے کی ان تمام چیزوں سے پرہیز کرے گا جو عام حالات میں اس کے لئے بالکل حلال اور طیب ہوتی ہیں۔ دن بھر اُس کے جسم کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ کھانا کھائے اور پانی پیئے لیکن وہ جسم کے اِس تقاضے پر ایمان کے تقاضے کو ترجیح دیتا ہے اور ان چیزوں کے قریب تک بھی نہیں جاتا۔ اس طرح روزہ انسان کو اس کا خوگر بنا دیتا ہے کہ وہ جسم کے تقاضوں پر ایمان کے تقاضوں کو ترجیح دے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ آپ کسی ایسے گول چکر کے قریب کھڑے ہو جائیے جہاں بہت سی سڑکیں ملتی ہوں اور دُور سے آتے ہوئے ایک سائیکل سوار کو دیکھئے۔ اگر اُس جگہ پر ٹریفک کا سپاہی کھڑا ہے تو سائیکل سوار قانون کی پابندی کرتے ہوئے نہایت شریفانہ انداز سے بائیں طرف جائے گا۔ لیکن اگر وہاں سپاہی نہ ہو اور دائیں طرف کا راستہ ذرا قریب ہو تو وہ جھٹ سے دائیں طرف مُڑ جائے گا اور تیزی سے سائیکل چلاتا ہوا فاتحانہ انداز سے آگے بڑھ جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم عام طور پر قانون کی پابندی اس وقت کرتے ہیں جب ہمیں ڈر ہو کہ ہم قانون شکنی سے پکڑے جائیں گے۔

اس کے برعکس آپ ذرا اس منظر کو سامنے لائیے کہ سخت گرمی کا موسم ہے۔ دوپہر کے وقت ایک روزہ دار ایک کمرہ میں تنہا بیٹھا ہے۔ پیاس کی شدت سے وہ بیتاب ہو رہا ہے۔ سامنے ٹھنڈے پانی کی صراحی رکھی ہے۔ لیکن وہ ایک گھونٹ پانی نہیں پیتا، حالانکہ اُس وقت اُسے کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا۔ اسے کیریکٹر کہتے ہیں۔ روزہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ جو شخص اپنے رب کے تقاضے کے ماتحت، حلال اور طیب چیزوں سے پرہیز کرتا ہے وہ حرام اور ناجائز چیزوں کو کس طرح ہاتھ لگا سکتا ہے خواہ کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں روزے کے احکام ختم ہوتے ہیں اس کے فوری بعد کہا گیا ہے کہ

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا
فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۱۸۸)

اور دیکھو! ایسا نہ کرو کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے کھاؤ اور نہ ایسا کرو کہ مال و دولت کو حکام تک پہنچاؤ تاکہ وہ اس بات کا ذریعہ بن جائے کہ تم دوسروں کے مال کا کچھ حصہ ناحق حاصل کر لو حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ تمہارا نہیں ہے۔

لہٰذا، روزے سے مقصود یہ ہے کہ انسان اس بات کا عادی ہو جائے کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں جائز اور ناجائز کی تمیز کرے۔ جائز کو اختیار کرے اور ناجائز سے پرہیز کرے۔ خواہ اُسے کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ (بہ اجازت ریڈیو پاکستان لاہور)

انسان نے کیا سوچا

مصنف کی نظرِ ثانی نے کتاب کی اہمیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے — یہ وہ کتاب ہے جس کی مثال انسانی کوششوں میں اور کہیں نہیں ملے گی اور جو صدیوں تک کبھی پرانی نہیں ہو گی۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پرویز صاحب جیسے مفکر کے بیس سال کے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ قیمت: بارہ روپے

ملنے کا پتہ: میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

الصّلوٰۃ اور الزّکوٰۃ

تانا بانا ہیں اس جنتی معاشرہ کا جسے قرآن

حسن مآب

(خوشگوار مستقر) قرار دیتا ہے

یہ معاشرہ کیسے قائم ہو سکتا ہے؟

اس کیلئے دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب

نظامِ ربوبیت

از

پرویز

ملاحظہ کیجئے

قیمت

چار روپے

(علاوہ محصول ڈاک)

تاریخ الامت

از

(علامہ اسلم جیراجپوریؒ)

۸ حصے

امت کی تمام سرگذشت

بیک وقت آپکے سامنے

آجائے گی

قیمت جلد اوّل - دو روپے جلد

دوم - دو روپے آٹھ آنے جلد سوم

جلد چہارم دو روپے آٹھ آنے جلد پنجم

تین روپے - جلد ششم دو روپے آٹھ آنے

جلد ہفتم دو روپے جلد ہشتم ۲ روپے ۸ آنے

اقبال اور قرآن

قرآن کے حقائق اور اقبال کا

بیان حسن و حقائق کا

اس سے زیادہ دل کش مرقع

اور کون سا ہو سکتا ہے

اس سے قبل اقبال پر بہت

کچھ لکھا جا چکا ہے - لیکن

اقبال اور قرآن میں جو کچھ

آپکے سامنے آئیگا اس سے

پہلے آپنے کہیں نہیں دیکھا

ہوگا -

قیمت :- دو روپے

ملنے کا پتہ :-

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷ - بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

دوسری طاہرہ بیٹی کا خط

محترم قبلہ مدظلہ

اپنی ایک اور بیٹی کا سلام قبول فرمایئے۔

"طاہرہ بہن" کا جو خط طلوع اسلام میں چھپا ہے اس کے لئے وہ واقعی مبارکباد کی مستحق ہیں۔ انھوں نے ہمارے بہت سے ایسے خیالات کی ترجمانی کی ہے جو ہمارے دل میں تو پیدا ہوتے تھے لیکن ہمیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کا اظہار کس طرح کیا جائے انھوں نے ہمیں ان کے اظہار کا طریقہ بتایا ہے اور آپ نے اس خط کو شائع کر کے ہمارا حوصلہ بڑھایا ہے کہ کوئی مقام ایسا بھی ہے جہاں ہم "بے زبانوں" کو بھی بات کرنے کی اجازت مل سکتی ہے۔ آپ واقعی ہمارے نہایت مشفق اور مہربان باپ ہیں۔ اپنے باپ سے رشتہ پیدائش کا ہوتا ہے۔ اس کا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ باپ اور اس کی اولاد میں سوائے پیدائش کے رشتہ کے اور کوئی بات مشترک نہ ہو۔ لیکن قرآنی باپ کا رشتہ دلی رشتہ ہوتا ہے جس کی بنیاد ہی صحیح خیالات کے اشتراک پر ہوتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کہا ہے کہ ان فانوں سے اس کا رشتہ اولاد کا نہیں (لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ) تو اس سے بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ اس کا رشتہ نسبی رشتوں سے بہت زیادہ گہرا ہے۔ اسی طرح قرآن شریف میں جو کہا گیا ہے کہ نبی کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں۔ ایسی مائیں کہ جن سے حقیقی ماؤں کی طرح نکاح نہیں ہو سکتا۔ تو اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کریمؐ مومنین کے لئے بمنزلہ باپ ہیں۔ اور آپ کی ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میرے ساتھ اس کی محبت اپنے باپ اور بیٹے اور تمام لوگوں سے بڑھ کر نہ ہو۔ اس سے یہ واضح ہے کہ یہ رشتہ نسبی رشتہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ حتیٰ کہ قرآن شریف نے کہا ہے کہ نبی، مومنوں کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہونا چاہیئے (سورۃ احزاب)۔ یہ اس رشتے کی گہرائی کی انتہا ہے۔ اس کی شہادت نبی کریمؐ کے ساتھیوں نے دی۔ انھوں نے اپنے ماں باپ۔ بہن بھائیوں۔ خویش اقارب۔ سب کو چھوڑ دیا لیکن نبی کریمؐ کو نہیں چھوڑا۔ اسی سے وہ نئی برادری وجود میں آئی جس میں نبی کریمؐ سب کے قرآنی باپ تھے اور سب

مومن آپس میں بھائی بھائی۔ یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کریم ان حقوق کو اپنے مقام پر رکھتا ہے جو قانون کی رو سے نسبی رشتہ داروں کو پہنچتے ہیں۔ اس سے سوسائٹی کا نظام قائم رہتا ہے۔ لیکن حقیقی رشتہ دین ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دین کے رشتے اور نسبی رشتے میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو وہ دین کے رشتے کو نسبی رشتے پر ترجیح دیتا ہے۔ حضرت نوحؑ اور ان کے بیٹے۔ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے باپ۔ حضرت لوطؑ اور ان کی بیوی کے واقعات جو قرآن شریف میں آئے ہیں وہ اسی حقیقت کے واضح کرنے کے لئے ہیں۔ (یہ باتیں ہم نے آپ ہی کی قرآنی تعلیم سے سیکھی ہیں اس لئے آپ کو یہ کچھ بتلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن "طاہرہ" کو بہن اور آپ کو باپ کہنے سے جو جذبات دل میں پیدا ہوئے انھوں نے مجھ سے یہ کچھ بے اختیار لکھوا دیا ہے۔)

طاہرہ بہن نے مردوں کے عورتوں پر تغلب کے جس جذبہ کا ذکر کیا ہے، تو انھوں نے اسے خاوند اور بیوی تک محدود رکھا ہے۔ لیکن میرا خیال (بلکہ تجربہ) یہ ہے کہ یہ جذبہ میاں بیوی تک ہی محدود نہیں۔ مرد جس حیثیت میں بھی ہو وہ عورت پر غالب رہنا چاہتا ہے۔ اور اسے اس کا حق سمجھا جاتا ہے۔ آپ گھر میں بہن بھائیوں کو دیکھئے۔ چھوٹا بھائی بڑی بہن کو مار تک بھی لے تو اسے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ بلکہ ماں باپ اس پر ہنستے ہیں۔ لیکن بہن سامنے سے گھُرکی بھی دے تو جھٹ باورچی خانے سے آواز آجاتی ہے۔ "تجھے صدقے کردوں۔ بھائی سے یہ کچھ کہتی ہے؟" یہاں سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور باپ بیٹی تک پہنچ کر اس کی انتہا ہو جاتی ہے۔ میں ایک کالج میں فلسفہ پڑھاتی ہوں۔ والد صاحب سخت قسم کے قدیم مذہبی خیالات کے ہیں۔ ویسے لکھے پڑھے ہیں لیکن مذہب کے بارے میں نہایت قدامت پسند ہیں۔ ایک تو میری طبعی افتاد ہی ایسی تھی۔ اس پر تعلیم کا اثر۔ نتیجہ یہ کہ میں دین کے متعلق، اپنی طالب علمی کے زمانے ہی سے عقل و بصیرت اور دلائل و براہین سے سوچنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس سلسلہ میں مجھے بہت پریشانیاں اٹھانی پڑیں لیکن آپ کی قرآنی فکر نے ان سب کو حل کر دیا۔ جس کے لئے میں واقعی دل سے آپ کو دعائیں دیتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم پر اب میرا ایمان علیٰ وجہ البصیرت ہے اور میں بڑے سے بڑے مفکر کو بھی اس کی ابدی صداقتوں کا قائل کرا سکتی ہوں۔ باہر کی دنیا میں تو میری حالت یہ ہے لیکن گھر میں مجھے بات بات پر اباجان سے ڈانٹ پڑتی ہے۔ ان کے قدیم معتقدات، جو نہ قرآن پر مبنی ہیں اور نہ علم و بصیرت پر، بلکہ یکسر تقلیدی ہیں، ان کے نزدیک اٹل حقیقتیں ہیں۔ وہ مجھے انہی کا پابند رکھنا چاہتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں تو میں درگذر کر جاتی ہوں لیکن جب بات کسی اہم نقطہ سے متعلق ہو تو میں سمجھتی ہوں کہ — اگر خاموش بنشینم گناہ است — بالخصوص اس لئے کہ میں سمجھتی ہوں کہ اس سے چھوٹے بہن بھائیوں کے خیالات پر کیا اثر پڑے گا — لیکن اس پر مجھ سے بالکل ایسا سلوک ہوتا ہے جیسے دس سال کے بچوں سے اسکول نہ جانے پر ہوا کرتا تھا۔ وہ کئی کئی دنوں تک مجھ سے ناراض رہتے ہیں۔ اور جب تک مجھے جھنجوڑ جھنجوڑ کر رُلا نہیں لیتے ان کے "جذبۂ پدری" کی تسکین نہیں ہوتی۔

آپ شاید کہدیں گے کہ ان کا مزاج ہی ایسا ہو گا، اس لئے یہ ایک انفرادی مثال ہے۔ اس میں "مرد اور عورت" کا سوال نہیں۔ لیکن بات یہ نہیں۔ میرے ایک چھوٹے بھائی ہیں جو آجکل نفسیات میں تعلیم پا رہے ہیں۔ وہ مذہب سے متنفر ہو کر الحاد اور بیدینی کی حد تک پہنچ چکے اور کمیونزم کے آغوش میں جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں ۔۔۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ کچھ نتیجہ ہے خود اباجان کی اسی قدامت پرستی اور سختی کا ۔۔۔ وہ گھر میں علانیہ مذہب کا مذاق اڑاتا ہے۔ لیکن اباجی ہیں کہ تنہائی میں سسکیاں بھرتے ہیں۔ روتے ہیں۔ خدا سے دعائیں مانگتے ہیں کہ وہ راہ راست پر آجائے۔ دوستوں سے اپنے غم کا اظہار کرتے ہیں لیکن کیا مجال جو بیٹے کی طرف لال آنکھوں سے بھی دیکھیں! کبھی کہیں گے تو صرف اتنا کہ بیٹا۔ خدا سے ڈرو۔ جس ماں کی گود میں تم نے پرورش پائی تھی، جس باپ کے زیر سایہ پروان چڑھے ہو وہ تو ایسے نہیں۔ تم نے یہ کچھ کہاں سے سیکھ لیا؟ میں اس کی اصلاح کر سکتی ہوں لیکن روز روز کی ڈانٹ ڈپٹ نے مجھے اس کی نظروں میں اس قدر ذلیل کر دیا ہے کہ وہ میرا بھی مذاق اڑاتا ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ اس تفاوتِ سلوک کی بنیادی وجہ تو وہی جذبۂ تغلب ہے جو مرد کے دل میں عورت کے خلاف بیدار رہتا ہے (خواہ عورت، بیٹی ہی کیوں نہ ہو)۔ لیکن اس کے ساتھ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ لڑکے کو کچھ کہا تو کل ہی سرکش ہو کر گھر سے بھاگ نکلے گا۔ لیکن میرے متعلق انھیں پتہ ہے کہ یہ کہیں جا ہی نہیں سکتی۔ اس کے لئے اس چھت کے علاوہ کوئی اور جائے پناہ نہیں۔ اس کا ہر مرد کو احساس ہوتا ہے کہ عورت کے لئے مرد کی چھت ناگزیر ہے۔ وہ بیٹی ہے تو اسے باپ کی چھت درکار ہے۔ بیوی ہے تو میاں کی چھت۔ اور ماں ہے تو بیٹے کی چھت۔ وہ میری اس کمزوری سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں ۔۔۔ نہیں کہہ سکتی کہ وہ دانستہ ایسا کرتے ہیں یا ان کے تحت الشعور میں چھپا ہوا "ایغو" ایسا کرا رہا ہے۔ نتیجہ بہرحال یکساں ہے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب مستقبل کا سوال میرے سامنے آیا تو میں نے اس پر کافی غور کیا تھا۔ میرے سامنے زندگی کا ایک مقصد تھا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ کالجوں کی لڑکیاں صحیح قرآنی اقدار سامنے نہ ہونے سے کس قدر بے راہ ہو رہی ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ مجھے اگر پڑھانے کا موقعہ مل جائے تو میرا مضمون کچھ ہی کیوں نہ ہو، میں ساتھ کے ساتھ بچیوں کے ذہن میں قرآنی اقدار کو جاگزیں کرنے کی کوشش کرتی جاؤں گی۔ (الحمد للہ کہ میں اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوں)۔ میں نے سمجھا تھا کہ یہ کچھ میں ازدواجی زندگی میں نہیں کر سکوں گی۔ پھر مجھے یہ بھی خیال تھا کہ اگر میرے شوہر میں اور مجھ میں خیالات کا اختلاف ہوا تو اس وقت مصیبت ہو جائے گی۔ اس لئے میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ خیالات کے اختلاف کی شکل میں، جو کچھ باپ کی طرف سے ہو رہا ہے، خاوند اس سے زیادہ اور کیا کرتا؟ باقی رہا یہ کہ مجھے اس وقت اس کی اجازت ہے کہ میں اپنے کام (کالج کی ملازمت) کو جاری رکھ سکوں، اور میرے خاوند شاید اس کی اجازت نہ دیتے۔ لیکن کبھی سوچتی ہوں کہ مجھے یہ اجازت بھی کہیں اس لئے تو حاصل نہیں کہ میرے خاندان کو اس

معاشی فوائد حاصل ہیں۔ نہ اس لئے کہ یہ میری زندگی کا مقصد ہے۔ میرے والد مخلص انسان ہیں اس لئے ان کے متعلق میں یہ نہیں کہنا چاہتی کہ ان کی ذہنیت ایسی ہے لیکن جب کبھی وہ یہ حساب کرنے لگ جاتے ہیں کہ میری تعلیم پر کتنا خرچ آیا تھا تو میرا خیال اس طرف چلا ہی جاتا ہے۔ شاید یہ میرے فلسفہ کا اثر ہے؟

یہاں تک تو دونوں شکلیں یکساں ہیں۔ لیکن اس سے آگے ایک مقام آتا ہے جہاں میں دیکھتی ہوں کہ ازدواجی زندگی کہیں بہتر ہوتی۔ یعنی مرد کا استبداد تو دونوں صورتوں میں یکساں ہوتا۔ اس وقت خاوند کا ہوتا، اب باپ کا ہے۔ لیکن اُس وقت وہ بات نہ ہوتی جو اب میرے لئے ہر وقت سوہانِ روح ہو رہی ہے اور جو (سچ پوچھئے تو) ایک عورت کے لئے عذابِ جہنم سے بھی بدتر ہے۔ میری عمر تیس سے اوپر ہو چلی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ ساری زندگی نہایت پاکیزہ گذری ہے۔ لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ میری ابھی تک سخت "نگرانی" کی جاتی ہے۔ آپ سوچئے کہ اس احساس سے ایک عورت کی عزتِ نفس کس طرح مجروح ہوتی ہے اور اس کی زندگی کس عذاب میں گذرتی ہے! شام کو ذرا کہیں دیر ہو جائے تو یہ سوال کہ "تم اتنی دیر کہاں رہیں" رات بھر کی نیند اچاٹ کر جانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ میں جب اس سوال پر غور کرتی ہوں تو آدھی رات کو اُٹھ اُٹھ کر روتی ہوں: میں کسی سے ہنس بول نہیں سکتی۔ میں اپنی مرضی کے کپڑے تک نہیں پہن سکتی۔ میں ان کی نظروں کو بھانپتی رہتی ہوں کہ وہ کس طرح میری ہر نقل و حرکت کا محاسبہ کرتی رہتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس اعتراف کے باوجود ہے جسے ابا جان، اکثر اپنے دوستوں کی محفل میں فخریہ کرتے رہتے ہیں کہ ایسی سعادتمند بیٹی اللہ ہر ایک کے نصیب کرے۔ تاروں کے سوا کسی آنکھ نے آج تک اس کا سر کھلا نہیں دیکھا۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ غیر شعوری طور پر یہ اعتراف دوستوں کی نظروں میں اونچا ہونے کے لئے ہی بیٹی پر اعتماد کرنے کو پھر بھی جی نہیں چاہتا۔ وہ اکثر مجھے چھوڑنے کے لئے کالج تک ساتھ جاتے ہیں اور ساتھ ہی واپس لاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دوستوں سے اکثر گلہ کرتے رہتے ہیں کہ اس بیٹی نے میری ساری آزادی سلب کر دی۔ اب میں نہ اپنی مرضی سے کہیں جا سکتا ہوں۔ نہ آ سکتا ہوں۔ میں تو بالکل بندھ گیا۔

میں اگر کسی دن کہتی ہوں کہ ابا جان! آپ یہ تکلیف نہ کیا کریں، میں سواری لے کر آ جایا کروں گی، تو انتہائی غمخواری کے عالم میں کہتے ہیں کہ بیٹی! جب تک تم میرے گھر میں ہو، تمہاری عزت میری عزت ہے۔ میں یہ کچھ تمہاری خاطر نہیں، اپنی آبرو کی خاطر کرتا ہوں! نہ جانوں، ان کے اس فقرے سے میرے دل کو بے ساختہ ایک ٹھیس سی کیوں لگتی ہے۔ حالانکہ جب میں حالات پر غور کرتی ہوں تو نظر آتا ہے کہ وہ بھی سچے ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں بدخصلت عناصر کی کمی نہیں۔ بلکہ اب تو ان میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ شریف زادیوں پر فقرے اور آوازے عام معمول ہو رہا ہے (خواہ وہ برقعے میں ہی کیوں نہ ہوں۔ میں تو برقعے میں ہوتی ہوں)۔ لیکن مصیبت اس سے آگے جا کر آتی ہے۔ اگر کوئی منچلا کسی لڑکی پر ہاتھ ڈال دے تو اگرچہ اس میں اس بیچاری کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی چاقو دکھا کر راستہ چلنے والے

سے اس کا سائیکل چھین کر لے جائے۔ جس کا سائیکل چھن جائے اسے تو لوگ مظلوم کہیں گے لیکن بعینہٖ انہی حالات میں جس لڑکی پر کوئی ہاتھ ڈال دے، وہ معاشرے کی نظروں میں انتہائی ذلیل ہو جاتی ہے۔ اس کی کوڑی قیمت نہیں رہتی۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔ کوئی نہیں سوچتا کہ اس بیچاری کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟ اور اگر خدانخواستہ نوبت اس مظلوم اور مجبور کی عصمت دری تک پہنچ جائے تو پھر اس کے لئے خودکشی کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس میں بھی اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔

یہیں سے ایک اور بات میرے سامنے آگئی۔ مردوں اور عورتوں کے لئے عصمت (chastity) کا معیار بھی مختلف ہے۔ جوان لڑکا آوارہ ہو تو (اس) کی ماں اس کے باپ سے کہے گی کہ لڑکا آوارہ ہو رہا ہے۔ اب اس نے راتوں کو بھی باہر رہنا شروع کر دیا ہے۔ بُری بُری باتیں اس کے متعلق سننے میں آتی ہیں۔ اب اسے کہیں "باندھ" دینا چاہیئے۔ اُدھر جب اس کے رشتے کی بات کہیں ٹھہرے اور کوئی ان سے کہہ دے کہ لڑکے کی شہرت اچھی نہیں، تو لڑکی کا باپ ہنس کر کہہ دے گا کہ اس عمر میں لڑکے یہ کچھ کیا ہی کرتے ہیں۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ یعنی لڑکا نہ اپنے ماں باپ کے نزدیک اور نہ ہی لڑکی کے ماں باپ کے نزدیک، قابلِ الزام ہے۔ اس کے برعکس، اگر خدانخواستہ کسی شریف لڑکی کے متعلق اتنی سی بات بھی باہر نکل جائے کہ اس نے کسی کو خط لکھا ہے (خواہ وہ خط اپنی کسی سہیلی ہی کو کیوں نہ لکھا ہو) تو "باغیرت" ماں باپ اسے زہر دے کر مار دینے پر تیار ہو جائیں اور اس کے رشتے کے لئے کوئی نام تک نہ دھرے۔ اس سے آگے بڑھیئے۔ کتنے شادی شدہ مرد ہیں جو علانیہ بدچلنی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود معاشرہ میں باعزت رہتے ہیں۔ اس کے برعکس، اگر کوئی شادی شدہ عورت خاوند سے پوچھے بغیر، ماں باپ کے ہاں بھی چلی جائے تو طلاق تک نوبت آجاتی ہے۔

میں (خدانخواستہ) یہ نہیں کہنا چاہتی کہ عورتوں کو بھی ایسی آزادی کیوں نہیں دی جاتی۔ میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ مرد اور عورت، دونوں کے لئے یکساں طور پر باعفت رہنا ضروری ہے۔ پھر یہ کیوں ہے کہ مردوں کی عفت کا معاملہ اتنا معمولی سمجھا جاتا ہے؟ کیا یہ بھی جذبۂ تغلب کا اثر نہیں؟ قرآن کریم نے اس باب میں کہیں کوئی فرق نہیں کیا۔ وہ مرد اور عورت دونوں سے یکساں طور پر عفت کا مطالبہ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس نے سزا بھی دونوں کی ایک ہی رکھی ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ ایک بات جب کسی عورت کے متعلق سنتے ہیں تو اسے گولی مار دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں لیکن وہی بات جب کسی مرد کے متعلق سنتے ہیں تو اسے ہنسی میں ٹال دیتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر مرد اور عورت دونوں سے یکساں عفت کا مطالبہ کیا جائے، اور لغزش کی صورت میں معاشرہ دونوں سے یکساں سلوک کرے، تو ہمارے ہاں کے نوّے فی صد جنسی جرائم کم ہو جائیں۔ اور پھر شریف زادیوں کو کوئی اس طرح تنگ نہ کر سکے۔

اس مقام پر ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ معاشرہ میں عورت کی حفاظت کی ضرورت ہے لیکن ہمارے ہاں شادی شدہ عورت کے مقابلہ میں، ناکتخدا کو زیادہ حفاظت کا محتاج سمجھا جاتا ہے۔ یہ تو کہہ نہیں سکتی

کہ شوہر کے مقابلہ میں باپ کو اپنی عزت کا زیادہ پاس ہوتا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ غیر شادی شدہ لڑکی کی حفاظت کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے، حالانکہ بدطینت عناصر کے سامنے کمزور ہونے کے لحاظ سے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لڑکی میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ یہ بھی شاید اس لئے کہ لڑکیوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ وہ شادی کے بعد ہی محفوظ سمجھی جا سکتی ہیں۔ شوہر کے بغیر نہیں۔

میں کہاں سے کہاں چلی گئی۔ میں کہہ رہی تھی کہ ابا جان کو اپنی آبرو کی خاطر، اتنا کچھ کرنا پڑ رہا ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ بدخصلت عناصر نے جو حالات پیدا کر رکھے ہیں ان کے پیش نظر اس کی ضرورت بھی ہے۔ اس لئے وہ جب یہ کہتے ہیں کہ میں یہ کچھ اپنی آبرو کے لئے کرتا ہوں، تو وہ سچ کہتے ہیں۔ اور جب اس کا گلہ کرتے ہیں کہ اس سے ان کی ساری آزادی سلب ہو گئی ہے۔ تو بھی وہ سچے ہوتے ہیں۔ اور جب میں ان حالات پر غور کرتی ہوں تو پہروں سوچتی رہتی ہوں کہ انھیں اس مصیبت سے چھڑانے کے لئے تو بہتر ہوتا کہ میں شادی کرا لیتی۔ لیکن جب سوچتی ہوں کہ اس سے کتنا عظیم مقصد فوت ہو جاتا تو پھر خاموش بیٹھ جاتی ہوں۔

فرمایئے! اس کا کیا علاج ہے؟ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر، ان کی شادی کر دیجئے تو وہ عذاب اور نقصان جس کا دردانگیز بیان طاہرہ بہن نے اپنے خط میں کیا ہے۔ انھیں ملک اور قوم کی بہبود کے لئے زندگی وقف کرنے کے لئے چھوڑ دیجئے تو یہ عذاب ـــــــ اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے؟

قوم کو اچھی نرسوں۔ اچھی لیڈی ڈاکٹروں۔ اچھی استانیوں۔ اچھی پروفیسروں کی ضرورت ہے، اور اشد ضرورت۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان نرسوں، لیڈی ڈاکٹروں، استانیوں اور پروفیسروں پر جو کچھ گذرتی ہے، قوم کو کچھ اس کا بھی خیال ہے؟

لیکن قوم تو شاید یہی سمجھتی ہے (اور قوم سے مراد مرد ہیں۔ خود لغت کی رُو سے قوم میں عورت داخل ہی نہیں ہوتی) ـــــــ قوم یہی سمجھتی ہے کہ عورت بنی ہی مرد کی چہیتا پر زندہ جلنے کے لئے ہے۔ اس لئے اگر مردوں کو اس کی ضرورت ہے کہ عورتیں بیوی بن کر رہیں، تو انھیں بیوی بن کر رہنا ہوگا۔ اور اگر انھیں استانیوں۔ ڈاکٹروں۔ نرسوں اور پروفیسروں کی ضرورت ہے تو انھیں یہ فرائض سرانجام دینے ہوں گے۔ اس سے ان کے راستے میں جو مشکلات آتی ہیں، ان کے حل کے لئے قوم کو درد سر مول لینے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ ہے میری بہن! اس عورت کی داستان جو معاشی طور پر آزاد ہے۔ اور یہ ہیں، ہمارے اچھے بابا جی! آپ کی طاہرہ بیٹیوں کی وہ مشکلات جنہیں وہ پروانے کی طرح زبان پر لائے بغیر جھیلتی رہتی اور بالآخر مر جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کی ان مشکلات کا حل کوئی نہیں۔ اس مقام پر، اور تو اور، حکیم الامت تک بھی سپر انداز دکھائی دیتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ،

ہیں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

والسلام

"آپ کی دوسری طاہرہ بیٹی"

عزیزہ بیٹی! جیتی رہو۔ خدا تمہیں اپنے مقاصد میں کامیاب کرے۔

میں، سب سے پہلے، پہلی "طاہرہ بیٹی" کا شکرگذار ہوں کہ اس نے اپنے خط سے ایسی طرح ڈال دی جس سے یہ "بنات النعش" اپنی نورانی چادریں لئے، اس طرح اپنے بھائیوں اور بہنوں سے خطاب کر رہی ہیں۔ اس کے بغیر، ہمارے لئے ان حالات و کوائف اور جذبات و احساسات سے واقف ہونا، ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔

جیسا کہ میں نے اندازہ لگایا تھا، ہمارے غلط معاشرہ کی پیدا کردہ مشکلات ان لڑکیوں کے لئے بھی یکساں ہیں جو معاشی طور پر آزاد ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ بچیاں اپنے لئے کچھ آسائشیں مہیا کر لیں لیکن اس سے ان مشکلات میں کسی حد تک آسانیاں پیدا ہو سکیں گی، ان کا ازالہ نہیں ہو سکے گا۔ ان کا ازالہ اسی صورت میں ہو سکے گا جب ہمارا معاشرہ صحیح قرآنی خطوط پر متشکل ہو۔

میں اپنی ان بچیوں سے کہوں گا کہ تم نے اپنے سامنے زندگی کا عظیم مقصد رکھا ہے۔ یہ انسانیت پر بالعموم اور اپنی ملت پر بالخصوص تمہارا احسان ہے۔ تم نے ہمت نہ ہارنا اور ان مشکلات پر قابو پا کر، اپنے مقصد کے حصول میں آگے بڑھتے جانا۔ تمہارے قرآنی تصورات۔ بلند خیالات اور پاکیزہ سیرت، آنے والی نسلوں پر یقیناً اثر انداز ہوگی اور اس طرح یہ روشنی دور دور تک پھیلتی جائے گی۔ قوم کے مستقبل کی تعمیر تمہارے ہاتھوں سے ہوگی۔ وہ ہاتھ جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

سیرتِ اقوام را صورت گر است

تم اس کا خیال نہ کرو کہ قوم کی طرف سے تمہارے اس خلوص و ایثار کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ اگر قوم کا احساس بیدار ہوتا تو پھر رونا کس بات کا تھا؟ یاد رکھو! غلط معاشرہ کی اصلاح کے لئے پہل کرنے والوں (السابقون الاولون) کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے جو عورت کے مسئلہ کو عقدۂ ناکشود بتایا تھا تو وہ ہمارے موجودہ معاشرہ کی پیدا کردہ مشکلات کے پیش نظر تھا۔ قرآنی معاشرہ میں ایسی کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔ جہاں تک تشکیلِ معاشرہ میں عورت کے حصہ اور مقام کا تعلق ہے، حضرت علامہ کے نزدیک اس کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ عورت کے متعلق کہتے ہیں کہ

درخطِ سیمائے او تقدیرِ ما

وہ اسے مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

طینتِ پاکِ تو ما را رحمت است

قوتِ دین و اساسِ ملت است

(۲) میں ان بچیوں کے والدین سے عرض کروں گا کہ انھوں نے ایسے بلند مقاصد کے لئے اپنی زندگی وقف کی ہے آپ کا فریضہ ہے کہ آپ نہ صرف ان کے لئے حتی الامکان آسائشیں بہم پہنچائیں بلکہ اس کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ آپ کی، یا دیگر اعزہ کی طرف سے کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے کسی طرح بھی ان کے جذبات کو ٹھیس لگے۔ آپ کو اور آپ کے خاندان کو ان بلند اقبال، سعادت مند بچیوں پر فخر کرنا چاہیئے اور انھیں گھر میں عزت و تکریم کا بلند مقام دینا چاہیئے۔ آنے والی نسلیں آپ کی اس خدمت کو یاد رکھیں گی۔

(۳) اور آخر میں، معاشرہ کے ان احباب سے جن کے دل میں ملت اور اسلام کی بہبود کا احساس بیدار ہے پر زور گذارش کروں گا کہ، اگر آپ سر دست کچھ اور نہیں کر سکتے، تو کم از کم، اپنے ماحول میں ان بچیوں کو اس عزت کی نگاہ سے دیکھئے جس کی یہ مستحق ہیں اور ہر مقام پر بد طینت عناصر سے ان کی حفاظت کی کوشش کیجئے۔ یہ ہم سب کی مشترکہ بچیاں ہیں اور ان کی عزت قوم کی آبرو ہے۔

(۴) میں اس "دوسری طاہرہ بیٹی" کو اس کے قرآنی ذوق، بلند خیالات، مقدس جذبات اور پاکیزہ سیرت کے لئے مستحق تبریک و تہنیت سمجھتا ہوں۔ ہماری قوم اس قسم کی بیٹیوں پر جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔

عزیزہ بیٹی! اگر تم کسی وقت بھی سمجھو کہ میں تمھاری کسی مشکل میں کسی کام آسکتا ہوں تو مجھے بلا تامل اطلاع دینا۔ تم نے قرآنی رشتے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ تم مجھے اپنے والد بزرگوار سے بھی زیادہ مشفق اور غمخوار پاؤ گی --- خدا تمھارا حامی و ناصر ہو۔

ہزار دعاؤں کے ساتھ

سیکرٹیری بزم

طاہرہ کے نام
خطوط

قرآن نے عورت کو کیا حقوق دیئے ہیں اور اس کی مشکلات کا کیا حل تجویز کیا ہے؟ - قیمت حصہ اول - دو روپے - دوم دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:- میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷ - بی --- شاہ عالم مارکیٹ --- لاہور

مغربی پاکستان ہائی کورٹ کا ایک اہم فیصلہ
جس میں اس نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے کہ

اسلامی قانون کی اصل بنیاد کیا ہے؟

شائع کردہ

ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی گل برگ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جولائی ۱۹۶۰ء میں، مغربی پنجاب ہائی کورٹ کے فاضل جج جسٹس محمد شفیع صاحب نے ایک اپیل کا فیصلہ صادر فرمایا جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے ارباب فکر و نظر کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ اپیل تو ودنابالغان کے حق ولایت سے متعلق تھی لیکن فاضل جج نے اس ضمن میں اس اہم نکتہ سے بحث کی ہے کہ اسلامی قانون کہتے کسے ہیں اور اس کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ بالفاظ دیگر اسلام میں قانون کی آخری سند کیا ہو سکتی ہے۔

اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر، ہم اس اہم فیصلہ کا اردو ترجمہ شائع کرتے ہیں۔ اس میں سے وہ حصے حذف کر دیئے گئے ہیں، جن کا، ہمارے نزدیک، نکتۂ زیر نظر سے براہ راست تعلق نہیں۔ ویسے تو یہ فیصلہ (THE ALL-PAKISTAN LEGALDECISIONS) کی نومبر ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔ جہاں سے ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ لیکن ہم اسے، مغربی پاکستان ہائی کورٹ کی اجازت سے شائع کر رہے ہیں جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

جو حضرات اس فیصلہ کو بطور قانونی سند لینا چاہیں وہ اصل (انگریزی) فیصلہ کی طرف رجوع فرمائیں۔ ہمارا ترجمہ اصل کا بدل نہیں بن سکتا۔

(طلوع اسلام)

PLD 1960 1142

باجلاس جسٹس محمد شفیع صاحب

مسماۃ رشیدہ بیگم ———— مرافعہ گذار

بنام

شہاب الدین وغیرہ ———— مرافع علیہم

اپیل اولیٰ بخلاف آرڈر کیس نمبر (۷۵) بابت ۱۹۵۸ء

فیصلہ صادرہ بتاریخ ۱۲ جولائی ۱۹۶۰ء

فیصلہ

روئدادِ مقدمہ

ایک شخص مسمی عمر دین ساکن تو لیکی تحصیل وضلع گوجرانوالہ ۱۹۵۱ء میں فوت ہوگیا۔ اس نے ایک بیوہ مسماۃ رشیدہ بیگم جس کو بعض مقامات پر رشیدہ بی بی کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ اور دو نابالغ لڑکیاں سکینہ بی بی متولدہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء اور آمنہ بی بی متولدہ ۱۰ ستمبر ۱۹۵۰ء وارث چھوڑے۔ اس کی جائیداد مالیتی دس ہزار روپیہ بشکل اراضی متروکہ رہی۔ عمر دین کی بیوہ رشیدہ بیگم نے ۱۹۵۳ء میں ایک شخص مسمی امام دین سے عقد ثانی کرلیا۔ . . . . یہ مسلمہ ہے کہ نابالغ لڑکیوں کی امام دین سے، چہ جائیکہ وہ محرم ہو، کوئی رشتہ داری ہی نہیں ہے۔ متذکرہ صدر عمر دین کے برادرِ حقیقی شہاب دین نے ۲۰ اگست ۱۹۵۴ء کو عدالت میں درخواست دی کہ اسے ہر دو نابالغان کی ذات وجائیداد کا ولی مقرر کیا جائے۔ مسماۃ رشیدہ بیگم نے اس درخواست کی اس بنا پر مخالفت کی کہ شہاب دین نابالغوں کے مقابلہ میں حق مخالفانہ رکھتا ہے۔ نیز یہ کہ خود نابالغوں کا مفاد اس میں ہے کہ ان کی ذات وجائیداد کو بدستور ماں کی تحویل میں رہنے دیا جائے۔ فاضل حاکم عدالت ولایت، گوجرانوالہ نے ۷ اپریل ۱۹۵۵ء کو شہاب دین کی درخواست کی منظوری کا حکم اس شرط کے ساتھ صادر فرمایا کہ وہ دس ہزار روپیہ کا

چیلک اور ضمانت داخل کرے اور یہ بھی تجویز کی کہ ۳۰ مئی ۱۹۶۰ء تک نابالغان کو شہاب دین کے حوالہ کردیا جائے۔ نابالغان کی والدہ نے اس حکم کے خلاف اپیل دائر کی ہے۔

۲۔ شہاب دین کے پاس نابالغوں کی تحویل کے حکم کو جسٹس مسٹر کیانی اور جسٹس مسٹر اخلاق حسین نے اپنے حکم مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۶۰ء کے ذریعہ ملتوی فرمادیا۔ اس طرح نابالغ بچے اب تک ماں کے پاس ہی ہیں۔

۳۔ میرے سامنے یہ بحث کی گئی ہے کہ ماں نے اپنے بچوں کی حضانت کے حق کو ایک ایسے شخص سے عقد ثانی کرکے زائل کردیا ہے جو نابالغوں کے محرموں میں سے نہیں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خواہ نابالغوں کی اس میں سود بہبود ہی کیوں نہ متصور ہو، ماں اپنے بچوں کو اپنی تحویل میں رکھنے کی مستحق نہیں رہی۔ ان مباحث کی بنیاد دفعہ (۱۷) قانون ولایت (Guardians and wards Act) پر ہے جس کا متعلقہ فقرہ اس طرح پر ہے:-

> کسی نابالغ کے ولی کے تقرر یا استقرار حق حضانت کی منظوری کے وقت عدالت کو دفعہ ہذا کی شرائط کے تابع، اور اس (شخصی) قانون کے مطابق جو نابالغ سے متعلق ہے، اس بات کا دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ نابالغ کی سود و بہبود کس انتظام میں ہے۔

[اس کے بعد فاضل جج نے قانون ولایت کی دفعہ (۱۷) اور دفعہ (۷) کے متعلق قانونی بحث کی ہے۔]

فقہی قواعد

۴۔ اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ تقرر ولی کی ضرورت تھی اور دفعہ (۱۷) قانون ولایت صورت حال سے متعلق ہے تو ایک اہم مسئلہ تصفیہ طلب ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ وہ کونسا قانون ہے جس کے مطابق نابالغوں کے معاملات کا فیصلہ کیا جائے۔ یہ تو بالکل صحیح ہے کہ نابالغ اور ان کے والدین مسلمان ہونے کی حیثیت سے شرع شریف یعنی اسلامی قانون کے تابع ہیں لیکن کسی نابالغ کی ولایت کے مسئلہ کا تصفیہ کس قانون کے تحت کیا جانا چاہیئے اس کا جواب اتنا آسان نہیں۔ تقریباً تمام کتب فقہ میں، جن میں سے بعض بہت مشہور و ممتاز ترین مقننوں وکیلوں و ججوں کی تصنیف کردہ ہیں اور جن کا میرے دل میں بہت احترام ہے، چند قواعد مرتب کئے گئے ہیں جن کے تابع ایک عرصہ دراز سے ہندوستان اور پاکستان کے نابالغ مسلمانوں کی ذات اور جائداد سے متعلق امور کا فیصلہ کیا جارہا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کی تمام عدالتوں نے بشمول پریوی کونسل غیر منقسم ہندوستان میں برطانوی تسلط کے آغاز سے لے کر اب تک، ان قواعد کی نہایت شدت کے ساتھ پابندی کی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ برطانیہ کے ہندوستان کو فتح کرنے سے پہلے بھی قضاۃ اور مقننین ان ہی قواعد پر عمل کرتے رہے ہوں۔ اور بعد میں یہ سلسلہ اس لئے قائم رہ گیا ہو کہ مسلمان مقننین نہیں چاہتے تھے کہ برطانوی یا دوسرے غیر مسلم اصحاب قرآن کریم کی تعبیر کریں اور اپنے مفید مطلب "قانون" مرتب کرنے لگ جائیں۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری کو جو تمام مسائل فقہی میں اتنی اہمیت حاصل ہوگئی ہے، اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے۔ لیکن اب صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔

(اس کے بعد فاضل جج نے یہ بتایا ہے کہ فقہ حنفی وغیرہ میں نابالغان کی ولایت کے متعلق کیا قوانین ہیں۔)

ان قوانین کی حیثیت

۷۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں اہم امر تصفیہ طلب یہ ہے کہ آیا کسی تعین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ قواعد قانونِ شرعی ہیں اور ان کی اسی طرح تعمیل اور پابندی ہونی چاہیئے جس طرح مقننہ کے منظور کیے ہوئے قانون کی ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر آیا یہ قواعد ایسے ہیں جنہیں وہ قانون کہا جا سکتا ہے جو دفعہ (۱۴) قانونِ ولایت کے مفہوم میں مسلمان نابالغین پر منطبق ہوتا ہے۔

۸۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق، خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو، وہ قانون جو تمام معاملات میں اس کے لئے واجب الاتباع ہوتا ہے۔ خواہ وہ معاملات مذہب سے متعلق ہوں یا گرد و پیش کی دنیا سے۔ خواہ وہ سیاسی امور ہوں یا معاشرتی اور معاشی ---- صرف وہ ہے جو خدائے بزرگ و برتر کی وحی کی بنا پر قائم ہو۔ اس لئے کہ وہی شہنشاہ ذوالجلال ہے وہ اعلیٰ ترین ہستی جو علیم و خبیر ہے اور لا انتہا قوت و اقتدار

اسلام میں قانون سازی کا حق

کی مالک۔ اسلام میں خدا اور بندہ کا تعلق بلاواسطہ اور سیدھا سادہ ہے۔ کوئی پروہت، کوئی امام، کوئی پیر، کوئی اور ہستی خواہ کسی نوعِ انسانی کی ہو، مردہ یا زندہ۔ قبر کے اندر یا قبر کے باہر، اس تعلق میں مداخلت نہیں کر سکتی۔ (خدا اور بندے کے درمیان واسطہ نہیں بن سکتی)

ہمارے ہاں ایسے مذہبی پیشواؤں کا کوئی ادارہ نہیں جو اپنے من مانے عقاید دوسروں سے، اپنی بد دعا کی دھمکی، اور عتابِ خداوندی کے ڈراوے سے اس طرح منوا لیں گویا کہ اس عتاب کا لے آنا ان کے اختیار میں ہے۔ تمام لوگوں کو قرآن شریف کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر فکر و عمل کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اسلام ایسا ماحول عطا کرتا ہے جس میں ذہنی اور روحانی آزادی ہوتی ہے۔ چونکہ قانون سازی سے انسانی آزادی پر پابندی عائد ہو جاتی ہے۔ اس لئے قانون سازی کا حق خدا اور صرف خدا ہی کو حاصل ہے۔ اور اسلام اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص اس طرح کچھ کرے گویا کہ وہ دوسرے پر فوقیت و برتری رکھتا ہے۔ قرآن کا مقصد اس قسم کی انانیت کو ختم کر دینا ہے۔ اخوتِ عامہ اور مساواتِ انسانی کی تعلیم نے کسی شخص کا اپنے آپ کو دوسروں سے افضل سمجھنے کا امکان، خواہ وہ علم کے میدان میں ہو یا کسی اور شعبہ میں، اسلام کے اخلاقی نظام سے یکسر خارج کر دیا ہے (پس) ساری دنیا کے نہ سہی کم از کم ایک ملک کے مسلمانوں کو تو (ایک ناقابلِ تقسیم) وحدت میں متشکل ہو جانا چاہیئے۔

اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے

اسلامی مملکت میں کسی شخص کے لئے اس کا امکان نہیں کہ وہ اعلیٰ ترین اقتدار اور شاہی اختیار کا مدعی بنے حتیٰ کہ اسلامی ریاست کے سربراہ کو بھی اس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں ہوتا کہ وہ احکام و قوانینِ خداوندی کا نفاذ و اجراء کرے۔ اس بات کا تصور ہی منشائے قرآنی اور روحِ اسلامی کے منافی ہے کہ کسی فرد کو مسلمانوں کے لئے قوانین وضع کرنے کا

اختیار ہے۔ قرآن شریف جگہ جگہ، پوری شدت کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ خدائے ذوالجلال اور صرف اسی کی ذات اس دنیا اور آخرت کا شاہنشاہ ہے اور اسی کے احکام واجب التعمیل اور قطعی ہیں۔ چنانچہ چھٹی سورۃ کی آیت ۵۸ اور بارہویں سورۃ کی آیات ۴۰ اور ۶۷ میں ارشاد ہوا ہے کہ احکم الحاکمین صرف خدا کی ذات ہے۔ اسی طرح چالیسویں سورۃ کی بارہویں آیت میں فرمایا گیا ہے۔

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ

پس فیصلہ (حکم) کا حق صرف خدا کو حاصل ہے جو سب سے بلند اور بڑا ہے۔

یہ حقیقت کہ صرف خدائے ذوالجلال ہی بادشاہ ہے، سورۂ حشر کی آیات (۲۳) و (۲۴) سے بھی بہت اچھی طرح واضح ہے ارشاد ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۵۹/۲۳)

اللہ وہ ہے کہ جس کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ بادشاہ۔ تمام کمزوریوں سے پاک۔ سلامتی والا۔ امن دینے والا۔ نگہبان۔ غالب۔ صاحب قوت۔ سب سے بڑا۔ جن چیزوں اور قوتوں کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ ان سب سے دور ہے۔

۹۔ رسول اللہ اور حضورؐ کے بعد خلفائے اربعہؓ کا عمل اس حقیقت کی کافی شہادت ہے کہ انسانوں کی بادشاہت

رسول اللہؐ اور خلفائے راشدینؓ

ایک غیر اسلامی چیز ہے اور منافی اسلام۔ ورنہ اُن کے لئے نہایت آسان تھا کہ وہ اپنے کو مسلمانوں کا بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیتے اور اگر وہ اس طرح اعلان کر دیتے تو اسے بہ طیب خاطر قبول بھی کر لیا جاتا۔ کیونکہ وہ بلاشبہ کافی قابلیت اور امانت وراستبازی کے مالک تھے۔ اسی اعتماد کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے نہ کبھی ایسا دعوےٰ کیا اور نہ ہی وہ ایسا تصور کرتے تھے کہ گویا وہ اسلامی دنیا کے مطلق العنان حاکم ہیں۔ وہ جو کچھ بھی کرتے دوسرے مسلمانوں کے مشورہ سے کرتے۔ ان کا ایمان تھا کہ تمام مسلمان ایک برادری ہیں۔ اسلامی عقیدہ بھی یہی ہے۔ فی نفسہٖ اس عقیدے کے لحاظ سے ایک انسان کی دوسرے پر برتری خارج از بحث ہو جاتی ہے۔ اسی سے اجتماعی فکر اور اجتماعی عمل کی بنا پڑی۔ ان میں نہ کوئی حاکم تھا نہ کوئی محکوم۔ نہ کوئی مرشد اور نہ کوئی پیر۔ ان میں سے ہر شخص امام بننے کی صلاحیت رکھتا تھا لیکن یہ بھی ظاہر ہی تھا کہ جو لوگ زہد و تقویٰ یا اور کسی شعبہ میں فضیلت کے مالک ہوں، دوسرے ان کی اقتدا کریں۔ (یہ زہد و تقویٰ کے مالک ان کے اولوالامر ہوتے تھے)

[اس کے بعد فاضل جج نے یہ بتایا ہے کہ خلافت، ملوکیت میں کس طرح تبدیل ہو گئی]

اصول انتخاب

قرآن شریف کی رُو سے صرف ایسا شخص ہی سربراہ ریاست ہو سکتا ہے جس میں علم و فضیلت اور جسمانی صلاحیت ہو۔ اس اصول کی رُو سے ریاست کے لئے وراثت کی بنیاد پر سربراہ کاری کے حق کی نفی ہو جاتی ہے اس بارے میں آیات ذیل کا نقل کرنا موجب استفادہ ہوگا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ .... وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۲۴۷/۲)

پھر ایسا ہوا کہ ان کے نبی نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو حکمراں مقرر کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے ہم پر حکمرانی مل جائے حالانکہ اس سے کہیں زیادہ حکمراں ہونے کے ہم خود حقدار ہیں۔ اسے تو مال و دولت کی وسعت بھی حاصل نہیں۔ نبی نے یہ سن کر کہا کہ اللہ نے تو طالوت ہی کو (حکمرانی کی قابلیتوں کے لحاظ سے) تم پر فضیلت عطا کی ہے، اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں میں اسے وسعت دی ہے۔ حکمرانی مشیت خداوندی (کے اصول) کے مطابق ملتی ہے۔ وہ بڑی وسعت والا۔ سب کچھ جاننے والا ہے۔

۱۱۔ جیسا کہ پہلے بتلایا جا چکا ہے، اسلامی قانون کی رُو سے منصب قانون سازی خدا اور صرف خدائے بزرگ و برتر ہی کو حاصل ہے۔

حق قانون سازی صرف خدا کو حاصل ہے

آدم کے وقت سے لے کر خدائے تعالیٰ اپنے احکام پیغمبر اور مرسلین کے ذریعے انسانوں تک پہنچاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جبکہ مشیت خدائے علیم و خبیر نے مناسب سمجھا کہ انسانوں کے لئے ایک قطعی اور آخری قانون مرتب کر دیا جائے۔ چنانچہ بنی نوع انسان کے لئے یہ قانون نبی اکرمؐ پر وحی کے ذریعہ نازل کیا گیا جس کو یا تو فوراً حفظ کر لیا جاتا یا کتابت کر لی جاتی۔ یہ وحی ایک کتاب کی شکل میں جمع ہوئی جسے قرآن پاک کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

خدا کا قانون قرآن کریم کے اندر ہے

اس کے بعد تمام نوع انسان۔ مرد، عورتیں، بچوں کے افعال و اعمال پر انہی احکام خداوندی کی رو سے کنٹرول ہونا تھا۔ جو قرآن شریف میں مدون ہیں یہی احکام بتاتے ہیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ پسندیدہ کیا ہے اور ناپسندیدہ کیا۔ جائز کیا ہے اور ممنوع کیا۔ ممدوح کیا ہے اور مقبوح کیا۔ مختصر یہ کہ معاشرہ اسلامی کی لازمی بنیاد قرآن کریم ہے۔ یہی مرکز ہے اور یہی وہ محور ہے جس کے گرد مسلمانوں کا سارا قانون گھومتا ہے۔

۱۱۔ الف

یہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ معاشرہ انسانی ایک نہایت پیچیدہ چیز ہوتی ہے۔ اگرچہ فطرت ایک ازلی و ابدی مشیت کا مظاہرہ منصور ہونی چاہیئے اور اٹل قانون کے تابع،

مستقل اور قابل تغیر و متبدل قوانین

لیکن انسانی زندگی کے حالات و معاملات ہر زمانہ اور ہر مقام پر ایک اور یکساں نہیں ہوتے۔ شخصیتوں اور مادی حالات کے امتزاج آیندہ پیدا ہونے والے مواقع کی کوئی خاص

صورت متعین نہیں کرتے۔ انسانی طبائع کے گوناگوں ہزاروں مدارج و مسائل ہزارہا اقسام کے ماحول سے دوچار ہوتے ہیں۔ پھر مشیت ایزدی کا کچھ ایسا انتظام ہے کہ ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہوتا ہے اپنے ایک جداگانہ جدت (ایجنسی) تخیل کا مالک ہوتا ہے اور ہر آنے والا دن انسان کے لئے ایک غیر متوقع اختلاف احوال و ماحول اپنے ساتھ لاتا ہے۔
پس اس دنیا میں، جہاں لوگوں کے ماحول اور معاملات ہر آن بدلتے رہتے ہیں اور نئے لوگوں کی پیدائش اور نئے حالات کے پیدا ہونے سے بدلتے ہی جاتے ہیں۔ کس طرح یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ قواعد و ضوابط بہر صورت غیر متبدل رہیں۔ قرآن مجید بھی اس عام اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ وہ مختلف النوع امور حیات انسانی کی راہ نمائی کے لئے وسیع اور عمومی نوعیت کے قاعدے بتلا دیتا ہے۔ اس سے ہمیں مجرد قواعد کا ایک مکمل نظام اور ایک خاص ضابطہ عمل و کردار مل گیا ہے جس کی بنا صفات حسنہ پر ہے۔ بعض معاملات مثلاً وراثت ترکہ وغیرہ میں اس کے احکام بہ نسبت دیگر معاملات کے زیادہ واضح اور تفصیلی ہیں۔ بعض امور ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں تمثیلی انداز میں ہوا ہے۔ اور بعض ایسے بھی جن کے بارے میں وہ بالکل ساکت ہے تاکہ لوگ ایسے معاملات میں مقتضائے معاشرہ و حالات حاضرہ کے لحاظ سے اپنے طرز عمل کو منضبط کرلیں۔

قرآنی احکام واضح ہیں

قرآن شریف میں اس بات پر بار بار زور دیا گیا ہے کہ وہ ایک نہایت سادہ زبان میں نازل کیا گیا ہے تاکہ ہر کوئی اسے بسہولت سمجھ سکے۔ احکام قرآنی کی سادگی اور وضاحت سے متعلق بعض آیات مبارکہ نقل کر دینا یہاں مفید ہوگا۔

سورۂ بقرہ میں ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲۴۲)

اس طرح اللہ تم پر اپنی آیات واضح کر دیتا ہے تاکہ تم سوچو سمجھو۔

سورۂ انعام میں ہے

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ
قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (۹۸)

وہی ہے جس نے تمہیں نفس واحدہ سے نشوونما دی۔ پھر تمہارے لئے قرار پانے کی جگہ ہے اور سپردگی کا مقام۔ بلاشبہ جو لوگ سمجھ سوچ سے کام لینے والے ہیں ان کے لئے ہم نے اپنی آیات کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔

اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۱۰۵)

اور اس طرح ہم پھیر پھیر کر آیات بیان کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ بول اٹھیں کہ تو نے (سب کچھ) ذہن نشین کرا دیا لیکن اس لئے کہ جو لوگ جاننے والے ہیں ان کے لئے دلائل واضح کر دیں۔

اور آگے چل کر۔

وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ (۶/۱۲۷)

اور یہ تمہارے پروردگار کی سیدھی راہ ہے۔ بیشک ہم نے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت پر دھیان دینے والے ہیں آیات کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔

[اسی طرح فاضل جج نے حسب ذیل مزید آیات درج کی ہیں جن میں اس نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے۔ ۱/۱ ; ۱۲/۲ ; ۱۵/۱ ; ۱۷/۸۹ ; ۱۷/۱۰۶ ; ۲۹/۲۸ ; ۴۴/۱۶-۲۲ ; ۵۶/۹ ; ۵۶/۱۶ ; ۶۶/۲۵ ; ۳۰/۵۸ ; ۴۱/۴۴]

قرآن فہمی کا حق ہر ایک کو حاصل ہے

پس یہ واضح ہے کہ قرآن شریف کے پڑھنے اور سمجھنے کا حق اور رعایت کسی ایک یا دو اشخاص کو نہیں۔ وہ نہایت صاف وسلیس اور عام فہم زبان میں اتارا گیا ہے تاکہ تمام مسلمان جو کوشش کریں اسے سمجھ سکیں اور اس پر عمل کریں۔ پس قرآن کریم کے پڑھنے اور اس کی تعبیر کرنے کا حق ہر مسلمان کو موہبت کیا گیا ہے۔ جسے اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ خواہ وہ کتنا ہی عالی مقام وفاضل وکامل کیوں نہ ہو۔ اس کے سمجھنے میں فاضل قدما کی لکھی ہوئی تفاسیر سے بیشک مدد لی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان تفاسیر کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس بارے میں قول فیصل یا آخری لفظ ہیں۔ قرآن مجید کے پڑھنے اور اس کے سمجھنے میں اس کی بھی تعبیر شامل ہے۔ اور تعبیر سے مراد یہ ہے کہ (اس کے احکام کو عملی مسائل پر کس طرح) منطبق کیا جائے اور یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا انطباق بہرحال، موجودہ حالات کی روشنی اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ہوگا۔

فقہی قوانین غیر متبدل نہیں

زمانہ قدیم کے مفسرین مثلاً امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ وغیرہم نے، جن کی عظمت واحترام جیسی ہر مسلمان کے دل میں ہوتی ہے میرے دل میں بھی ہے، اس کتاب مقدس کی آیات کی جو تعبیریں کی ہیں وہ موجودہ زمانہ میں من وعن قبول نہیں کی جا سکتیں اور یہ واقعہ ہے کہ ان کی سب تعبیروں پر انہی کے ہم منزلت علماء سے متاخرین نے، جن میں خود ان ائمہ کے شاگرد بھی شامل ہیں، اتفاق وصدق قلبا نہیں کیا۔ مختلف مسائل قرآنی پر ان اصحاب نے جو عمیق غور وفکر کیا ہے اس سے ہم پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ حضرات مقتضائے حالات اور ماحول زمانہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں۔ جو مسائل ان کے زمانہ میں اور ان کی جائے سکونت پر ان کے سامنے پیش ہوئے انہوں نے ان کا تصفیہ کر دیا۔ لہٰذا اگر بارہ سو تیرہ سو سال قبل کے مفسرین کی تعبیریں کسی مسئلہ پر حرف آخر قرار پا جائے تو سارا اسلامی معاشرہ

ایک آہنی قفس میں مقید ہو جائے گا۔ اور اسے زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر ہونے کا موقع نہ رہے گا نہ ہی وہ ایک عالمگیر دین ہونے کی حیثیت برقرار رکھ سکے گا۔ وہ صرف اُس زمان و مکان میں محدود و مقید ہو کر رہ جائے گا جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ جب قرآن مجید نے تمام معاملات کے لئے ازلی اور ابدی جزئی قوانین متعین کر کے نہیں دیئے تو امام ابوحنیفہ وغیرہ کی تعبیرات کی یہ حیثیت کیسے ہو سکتی ہے۔! بدقسمتی سے چند صدیوں سے نئے حالات و مقتضیات کے تحت قرآن شریف کی تعبیر و تفسیر کا دروازہ بند ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان مذہبی سکتہ میں مبتلا۔ سیاسی فالج کے مریض، اور ثقافتی ابتری اور اقتصادی زوال کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔

اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہو سکتا

سائنٹفک انکشافات اور علمی ترقیاں جو کسی زمانہ میں مسلمانوں کا اجارہ تھیں اب دوسروں کے پاس چلی گئی ہیں اور ایسا نظر آتا ہے کہ مسلمان (گویا) ابدی نیند سو گئے ہیں۔ اس زبوں صورت حال کو ختم ہو جانا چاہیئے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ بیدار ہو کر زمانہ کے ہمدوش ہو جائیں۔ اس معاشرتی۔ اقتصادی اور سیاسی جمود کو جو مسلم اقوام کو دبوچے ہوئے ہے جھٹک دینا چاہیئے۔ قرآن کریم کے عام اصولوں کو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات پر منطبق کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تعبیر، علم و بصیرت کی رو سے، اس طرح کی جائے کہ عامۃ المسلمین میں اپنی تقدیر آپ بنانے اور اپنے خیالات اور اخلاقی تصورات کی خود تشکیل کرنے کا مادہ پیدا ہو، اور جس ملک اور جس زمانہ میں وہ رہتے بستے ہیں ان میں اس کی پوری پوری مناسبت سے عمل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ دوسرے انسانوں کی طرح، مسلمانوں کو بھی قسام ازل نے عقل و دانش موہبت فرمائی ہے۔ یہ جوہر استعمال میں لانے کی چیز ہے۔ اسے زنگ آلود کرنے کے لئے نہیں دیا گیا۔ دنیا کے مختلف خطوں کے مسلمانوں کو پوری پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ (اپنے معاملات میں) غور و تفحص کریں اور یہ تحقیق کریں کہ قرآن شریف کے کسی حکم کا منشا اور غایت خداوندی کیا ہے اسے ان کے حالات پر کس طرح منطبق کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا تمام مسلمانوں کے لئے قرآن شریف کا سننا سیکھنا اور سمجھنا لازمی ہے۔

قرآن کریم میں ایک گروہ کے متعلق ہے کہ

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ..... اَهْوَآءَهُمْ (۴۷/۱۶)

(اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو (بظاہر نظر آتا ہے کہ) تیری باتیں سن رہے ہیں (لیکن درحقیقت ان کا دھیان کہیں اور ہوتا ہے)۔ وہ جب تیرے پاس سے اُٹھ کر باہر نکلتے ہیں تو جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے ان سے پوچھتے ہیں کہ اس (رسول) نے ابھی ابھی کیا کہا تھا۔ یہی ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ (اس لئے کہ وہ) اپنی پست خواہشات کا اتباع کرتے ہیں۔

[اس کے بعد فاضل جج نے آیات $\frac{۶۲}{۲}$ تا $\frac{۳۸}{۲۹}$ درج کر کے لکھا ہے]

مسلمانوں کو چاہیئے کہ قرآن پر غور و فکر کریں اور اسے سمجھیں۔ اور اسے سمجھنے کے لئے انھیں جدید کوشش کرنی چاہیئے ایسی ہی جیسی کہ وہ کسی دنیوی مقصد کے حصول کے لئے کیا کرتے ہیں اسی کو اجتہاد کہتے ہیں۔

[اس کے بعد فاضل جج نے آیات ۴/۸۲؛ ۴۷/۲۴؛ ۳۸/۲۹ درج کر کے یہ بتایا ہے کہ قرآن کریم نے اجتہاد پر کس قدر زور دیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے۔]

یہ تمام آیات اچھی طرح واضح کر دیتی ہیں کہ قرآن شریف کا علم حاصل کرنے اس کے احکام کو اچھی طرح اور صحیح سمجھنے اور ان کی تعبیر کرنے کا کام کسی خاص گروہ کے سپرد نہیں کیا گیا بلکہ اسے تمام مسلمانوں کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ جہاں تک تعبیر کا تعلق ہے چند مسلمہ اور مستند اصول پیشِ نظر رکھنے ضروری ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قرآنی تعبیرات کے اصول

(۱) قرآن مجید میں بعض اوامر خاص، اہمیت کے حامل ہیں اور مسائل زیرِ بحث کی جڑ تک پہنچتے ہیں ان کی خلاف ورزی نہیں کی جا سکتی۔ ان کی اطاعت من و عن کرنی ہوگی۔

(۲) بعض احکام ہدایتی نوعیت کے ہیں ان کی غرض و غایت اور اصل و روح کو سامنے رکھ کر ان کی تعمیل کی جائے گی۔

(۳) جن احکام میں الفاظ صاف و صریح استعمال ہوئے ہیں اور مطلب بھی واضح اور غیر مبہم ہے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی لئے جائیں بالفاظ دیگر قرآن مجید کے الفاظ کا مفہوم متعین کرنے میں اس کی زبان کو توڑا مروڑا نہ جائے۔

(۴) اسے تسلیم کرنا چاہیئے کہ قرآن شریف کی آیات کا کوئی حصہ نہ تو بے معنی ہے اور نہ متضاد نہ ہی اس کا کوئی جزو زائد یا بیکار ہے

(۵) قرآن کے مفہوم کو اس کے متن سے الگ نہیں کرنا چاہیئے۔

(۶) قرآن شریف کی تعبیر بلحاظ شانِ نزول یا اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے کرنے کی سعی خطرناک ہے۔

(۷) تعبیر معقول ہونی چاہیئے۔ یعنی انسانی برتاؤ کا جو نقشہ ماحول سے متاثر ہو کر مرتب ہوتا ہے، قرآنی تعبیر میں اس کا لحاظ رکھا جائے۔ نیز یہ ملحوظ رہنا بھی ضروری ہے کہ نئے اور غیر متوقع حالات مسلسل پیدا ہوتے رہتے ہیں، معاشرہ کے تقاضے آئے دن بڑھتے جاتے ہیں۔ پس تعبیر احکام، حالات اور مقتضیات کی روشنی ہی میں ہونی چاہیئے۔

(۸) زمان و مکان کے لحاظ سے مختلف مواقع کی مماثلتوں اور اختلافات کا وزن و اندازہ کرنا ضروری ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ماضی کے احوال و ظروف جس طرح بدلتے بدلتے زمانہ حال تک پہنچے ہیں ان کا موازنہ کریں اور ان تبدیلیوں پر خاص نگاہ رکھیں۔ اور سابقہ فتووں کو بہ حیثیت قطعی تصفیوں کے نہ لیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ

وہ ظن وگمان پر مبنی ہوں یا مشروط بہ شرائط ہوں یا ایسی نوعیت کے ایقانات پر مبنی ہوں جو مسترد کر دیئے جانے کے لائق ہوں[1]۔

۱۲- بدقسمتی سے اس دنیا میں کبھی، اور کم از کم پہلے چار خلفاءؓ کے بعد سے کہیں، حقیقی اسلامی مملکت وجود میں نہیں آئی جس میں قرآن شریف کی تعبیر ایسے لوگوں کے ذریعہ ہوتی جو باہم مل جل کر رد و قدح اور بحث مباحثہ کے بعد اس کی تعبیر کرتے۔ قرآن شریف کے اصول ابدی ہیں مگر ان کا اطلاق ابدی نہیں کیونکہ اطلاق ہمیشہ واقعات کے لحاظ سے اور کسی مقصد سے ہوا کرتا ہے اور یہ دونوں ہمیشہ تغیر پذیر اور بدلتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید کا کوئی ایسا حکم لے لیجئے جس کی ایک سے زیادہ تعبیریں ہو سکتی ہوں۔ اس کے لئے اگر ہر مسلمان کو یہ اختیار دیدیا جائے کہ وہ اپنی فہم و فراست اور تخیلات و تصورات کے لحاظ سے اس کی تعبیر کرے تو اس سے مختلف تعبیریں معرض وجود میں آئیں گی اور عجیب قسم کا انتشار پیدا ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی مسئلہ ایسا لیا جائے جس کے بارے میں قرآن شریف ساکت ہے اور ہر شخص کو یہ اختیار مل جائے کہ وہ کردار و عمل کے لئے اپنے مخصوص .... انداز فکر کے لحاظ سے کوئی قاعدہ گھڑ لے تو اس سے معاشرہ کا شیرازہ ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ اسلامی معاشرہ بھی اور معاشروں کی طرح زیادہ سے زیادہ نفوس، کو زیادہ سے زیادہ مسرت مہیا کرتا ہے، جو کم سے کم تکلیف سے حاصل ہو سکتی ہے۔ پس امت کے زیادہ سے زیادہ افراد کی رائے ہی کسی مسئلہ میں غالب رہنی چاہیئے[2]۔

۱۳- یہ فطری امر ہے کہ کسی ایک فرد یا چند افراد کی دانائی و توانائی کو مکمل نہیں تصور کیا جا سکتا۔ کسی ایک شخص کو خواہ وہ کتنا ہی صاحب اقتدار اور دانشمند و فہیم کیوں نہ ہو کامل نہیں کہہ سکتے۔ حتیٰ کہ زیادہ سے زیادہ اس اور عالی خیال قلب بھی کسی شے کی تمام صفات پر جو سامنے آئیں وہ توجہ نہیں دے سکتا جو دینی چاہیئے۔ مرد، عورت اور بچے، ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں، جو باہم گرد ملتے جلتے اور رہتے بستے ہیں، اور نظم و ضبط کے ساتھ باہمی معاملات کرتے ہیں یقیناً ایک فرد کے مقابلہ میں زیادہ دانائی اور توانائی کا مادہ رکھتے ہیں۔ ان کی قوت متخیلہ بھی زیادہ قوی ہوگی اور قوت مدرکہ بھی۔ قرآن مجید کی رو سے بھی فرقان حمید کی تعبیر اور واقعات پیش نظر اس کے عام اصولوں کے اطلاق کا فریضہ کسی ایک شخص یا چند اشخاص کے سپرد نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کی سرانجام دہی ..... تمام امت کے باہمی مشورہ سے ہونی چاہیئے۔ اس کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)

مشاورتی نظام کو تعبیر کا حق حاصل ہے

---

[1] اس فقرہ کے متبادر مفہوم کو پیش کیا گیا ہے۔ ترجمہ نہیں کیا گیا (مترجم) [2] اسلام کے مشاورتی نظام کی طرف اشارہ ہے جس میں قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے نمائندگان امت باہمی مشورہ سے امور مملکت طے کرتے ہیں (مترجم)

جو لوگ اپنے رب (کے احکام کو) قبول کرتے ہیں اور اقامت صلوٰۃ کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پاتے ہیں۔

[اس کے بعد فاضل جج نے آیت ۳:۱۰۳ درج کی ہے جس میں مسلمانوں کو اعتصام بحبل اللہ کی تاکید کی گئی ہے۔]

(یہ اور) بہت سی دیگر آیات میں بھی تمام مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ قرآن شریف کو سمجھیں اور اس کی آیات پر غور و تدبر کریں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ کام افراد سے نہیں بلکہ اجتماعی طور پر انجام پائے۔

۱۴۔ اس سلسلہ میں یہ بھی جان لینا چاہیئے کہ "قانون" سے ہماری مراد کیا ہے۔ میری رائے میں قانون وہ ضابطہ ہے جسے امت کی اکثریت اپنے کردار و عمل کے لئے طے کرے۔

۱۵۔ شروع شروع میں انسانوں کی آبادی مختصر تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں منتشر طور پر بود و باش کرتے اور اپنے آپ میں مگن اور بے نیاز رہتے تھے ان حالات میں وہ اس قسم کی انفرادی زندگی بسر کر سکتے تھے پھر آگے چل کر جب ان کی تعداد بڑھی اور انہیں بڑے بڑے گروہوں یا قبیلوں کی شکل میں رہنا پڑا تو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ سب کے لئے کوئی عمومی ضابطہ کردار و عمل ہونا چاہیئے۔ مثال کے طور پر پچاس افراد پر مشتمل معاشرہ کو لے لیجیے (فرض کیجیے) اس میں قتل کی واردات ہو گئی۔ کثرت رائے یہ تھی کہ یہ فعل مجرمانہ تھا لیکن بعض افراد معاشرہ اسے ایسا خیال نہیں کرتے تھے۔ چونکہ کثرت رائے والی جماعت میں زیادہ قوت تھی اس نے اقلیت سے اپنی رائے منوالی۔ اب یہ قانون ہو گیا کہ ان پچاس آدمیوں کے قبیلہ میں کوئی شخص قتل کا ارتکاب نہ کرے۔ یہی مثال زمانہ موجودہ پر بھی صادق آئے گی۔ ایک ایسے ملک میں جو کئی کروڑ اشخاص پر مشتمل ہو قرآن شریف کے ان مقامات کی تعبیر کا حق، جن کی مختلف تعبیرات کی جا سکتی ہوں اکثریت ہی کو ہونا چاہیئے۔ وہی طے کرے گی کہ ان کے واقعات اور حالات کے لحاظ سے کونسی تعبیر موزوں اور مناسب ہے یا قرآن کریم کے عام اصولوں کا حالات حاضرہ پر کیسے اطلاق کیا جائے تاکہ فکر و عمل میں یکسانیت اور عمومیت پیدا ہو۔ اسی طرح امت کی اکثریت ہی کو یہ حق ہونا چاہیئے کہ ایسے مسائل پر جن کے بارے میں قرآن شریف ساکت ہے۔ مناسب قوانین مرتب کرے۔

جمہوریت کا مشاورتی نظام

دوسرا سوال جس پر بحث و تحقیق کی ضرورت ہے یہ ہے کہ یہ کروڑوں اشخاص قرآن شریف کی تعبیر کے حق کا استعمال کس طرح اور حالات حاضرہ پر عام اصولوں کا اطلاق کیونکر کریں گے۔ یا ان مسائل کے بارے میں جن کی نسبت قرآن شریف ساکت ہے کیسے قانون بنائیں گے۔ اس مسئلہ کا فیصلہ ملک کے حالات کے مدنظر ہی ہو سکتا ہے کہ وہ کونسا بہترین طریق ہے جس کے مطابق لوگ اپنے نمائندوں کا انتخاب کر سکتے ہیں جو ان کے اس حق کا صحیح استعمال اور اُن کی رائے کا صحیح اظہار کریں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب کسی ایک شخص کو اپنا نمائندہ منتخب کر لیں۔ لیکن تاریخ بتلاتی ہے کہ کسی ایک شخص کو اختیار مطلق کا سونپ دیا جانا

ہمیشہ تباہ کن نتائج کا حامل رہا ہے۔ اس کو اقتدار کا نشہ بدمست کر دیتا ہے اور ملک و قانون کی حکومت بگڑ جاتی ہے۔ اور جب اقتدار کُلّی و کامل ہو تو خود اس فرد میں اور حکومت قانونی اور ملک میں فساد بھی کُلّی اور مکمل ہوتا ہے۔ کسی ملک کی تاریخ میں ایسے حالات بھی سامنے آسکتے ہیں جنہوں نے ایک فردِ واحد کو مجبور کر دیا ہو کہ وہ ابتر صورت حال کی اصلاح کے لئے عنانِ حکومت خود اپنے ہاتھوں میں لے لے اور ملک کو تباہی سے بچا لے۔ لیکن یہ ایک عارضی دور ہے اور ملک میں جمہوریت اور عوام کے ہاتھوں میں اقتدار کو پھر بحال کرنے کے لئے ہر طرح جائز بھی۔ پس اسلامی قانون کی رو سے یہ نہایت اہم ہے کہ اقتدار زیادہ اشخاص کے ہاتھ میں دیا جائے تاکہ ایک شخص دوسرے کا نگران ہو اور امت کی رہبری کے لئے سب مل کر قانون کا مفہوم متعین کریں اور یہ فطری امر ہے کہ یہ لوگ امت کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ ہوں گے۔ یہی وہ

اسی کو اجماع کہتے ہیں

شکل ہے جس میں کسی خاص منصوبۂ عمل کا پروگرام کامیاب ہو سکتا ہے۔ اسلام میں اقتدار و قوت پوری ملت کو تفویض کی جاتی ہے اور صرف خدائے قدیر کی ذات سب سے بالاتر ہوتی ہے۔ یہیں فیصلے آزاد شہریوں کی حیثیت سے مشترکہ اور اجتماعی ہوتے ہیں۔ اسی کو اجماع سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۱۶۔ اجتہاد یا قوتِ فیصلہ کا استعمال ایک مسلمہ سرچشمہ ہے جس سے قوانین اخذ کئے جاتے ہیں تاکہ لوگ کسی

حق اجتہاد امت کو حاصل ہے

شکل یا شبہ مسئلہ قانونی کے متعلق رائے قایم کرنے میں اپنے قوائے ذہنی و عقلی کا پورا پورا استعمال کریں۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ نے اجتہاد پر بڑی فراخی سے عمل کیا۔ وہ طریقے جن کے ذریعہ امام ابوحنیفہؒ اور دیگر مقننین اسلام اپنی قوتِ فیصلہ کو کام میں لائے قیاس (تمثیلی استدلال) استحسان (EQUITY) استصلاح (مفادِ عامہ) اور استدلال (یعنی استنباط) کہلاتے ہیں۔ کسی ایک فرد یا چند اشخاص کے اجتہاد کو خود مسلمان مقننین نے بھی خطرناک تصور کیا ہے۔ اسی لئے وہ قانونی مسائل میں ان فتووں کو ترجیح دیتے تھے جو مجتہدین کی اکثریت کے اتفاقِ رائے کے مظہر ہوتے۔ یا مسلم مقننین کی اس متفقہ رائے کو جو کسی زمانہ میں کسی خاص مسئلہ قانونی پر ظاہر کی گئی ہو۔ اُس زمانہ کے لوگوں کے جدید اجتہاد کے حق کو چند مقننین تک محدود کر دینا درست اور حق بجانب بھی تھا کیونکہ تعلیم اور تعلم اس زمانہ میں اتنی عام نہ تھی۔ لیکن میرے خیال میں فی زمانہ یہ فرض عوام کے نمائندوں کو انجام دینا چاہیئے کیونکہ جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں قرآن کا پڑھنا اور سمجھنا اور اس کے عام اصولوں کا اطلاق کرنا اب ایک دو آدمیوں کی اجارہ داری نہیں رہی ہے۔ بلکہ ایک حق اور فرض ہے سارے مسلمانوں کا، اور اس کا انصرام اس شخص کے ذریعہ ہونا چاہیئے جسے انہوں نے اس مقصد کے لئے منتخب کیا ہے۔ ان تصریحات سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جن مسائل کے متعلق قرآن شریف کے احکام بالکل صاف اور واضح ہیں وہی مسلمانوں کا قانون ہیں۔ جہاں تک تعبیر اور ان اصولوں کے اطلاق کا تعلق ہے جو قرآن شریف نے بتلائے ہیں تو مسلمانوں کے لئے قانون وہی

وہی ہوگا جو اُن کے منتخب کئے ہوئے نمایندے متعین کریں۔ مندرجہ صدر نقطۂ نظر کی وضاحت چند تشریحات کے ذریعے ہوسکتی

ایک مثال سے وضاحت

ہے۔ سب سے اول میں قرآن شریف کی چوتھی سورۃ کی تیسری آیت کو لیتا ہوں جس کا اکثر ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا (۴/۳)

اور اگر تمہیں اس بات کا خدشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے حقوق کو منصفانہ طور پر ادا نہیں کرسکو گے تو اپنی پسند کی عورتوں سے نکاح کرلو۔ دو، تین، چار تک۔ لیکن اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم عدل نہیں کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی رکھو۔ یا وہ جو (اس سے پہلے) تمہاری ملک میں آچکی ہے۔ بے انصافی سے بچنے کے لئے ایسا کرنا زیادہ قرین ثواب ہے۔[1]

جیسا کہ میں اس فیصلہ کے ابتدائی حصہ میں لکھ آیا ہوں۔ قرآن شریف کے کسی حکم کا کوئی حصہ نہ فضول ہے اور نہ لایعنی یہ لوگوں کے منتخبہ نمایندوں کا کام ہے کہ وہ متعین کریں کہ آیا کوئی مسلمان ایک سے زیادہ عورتوں سے عقد کرسکتا ہے اور اگر کرسکتا ہے تو کن شرائط اور قیود کے تابع۔ بادی النظر ایسا عقد (ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ) صرف یتامیٰ کے مفاد ہی کے لئے ہوسکتا ہے۔

۱۷۔ بہرحال یہ شق اجازتی ہے۔ کوئی ایسا حکم نہیں جس کے ماننے پر ہم مجبور ہوں۔ (یعنی فرض نہیں) اس پر اسٹیٹ نگرانی کرسکتی ہے۔ پہلے کی تمثیل کو دُہراتے ہوئے جہاں پچاس نفوس کی اکثریت سے یہ قانون بن گیا کہ اُن میں سے کوئی

تعدد ازدواج

قتل کا مرتکب نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان کہتا ہے کہ میں ایک سے زیادہ عورتوں سے عقد نہ کروں گا کیونکہ مجھ میں اس کی استطاعت نہیں ہے تو اکثر کرو(؟) کی اکثریت قوم کے لئے یہ قانون قرار دے سکتی ہے کہ قوم کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالت اپنے ارکان کو ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

آیت پیش نظر کو قرآن شریف کی دوسری دو آیات کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیئے۔ ان دو آیتوں میں سے پہلی

---

[1] اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اگر کسی وجہ سے معاشرہ میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں اور شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد بڑھ جائے اور اس مسئلہ کا اور کوئی معقول حل نہ ہو، تو تم وحدتِ زوج کے اصول میں استثناء کرکے، ایک سے زیادہ بیویوں سے اس ہنگامی مشکل کو حل کرسکتے ہو۔ (طلوع اسلام)

(۲۴) ویں سورۃ کی (۳۳) ویں آیت ہے کہ ایسے اشخاص جن میں شادی کی استطاعت نہ ہو۔ شادی ہی نہ کریں۔ پس اگر کوئی شخص بوجہ عدم استطاعت ایک عورت سے عقد کرنے سے روک دیا گیا ہے تو اسے ایک سے زیادہ عورتوں سے عقد کرنے سے بھی اسی یا اس جیسی کسی اور وجہ کی بنا پر روک دینا ہوگا۔ اگر کسی شخص کو خاندان کی گذر بسر کے وسائل پر

ضبط تولید

دسترس نہ ہونے کی بنا پر عقد کرنے سے روکا جا سکتا ہے تو یہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے کہ کسی کے اتنے ہی بچے ہوں جن کی وہ پرورش برداشت کر سکے۔ وہ خود ضبط تولید (یعنی بچوں کی پیدائش پر تحدید) نہیں کرتا تو اسٹیٹ پر لازم ہے کہ وہ اس پر کنٹرول کرے۔ اب اس اصول کو ذرا اور وسعت دیجئے۔ مثلاً اگر کسی ملک کی غذائی حالت نازک ہے اور اضافہ آبادی کو محدود کرنے کی ضرورت ہے تو اسٹیٹ کے لئے یہ بالکل جائز ہوگا کہ وہ یہ قانون بنا دے کہ کوئی شخص ایک سے زیادہ بیویاں نہ کرے اور ایک بھی اسی صورت میں جبکہ اُس کے پاس اپنے خاندان کی پرورش کے وسائل اور استطاعت ہو۔ یا یہ کہ اس کے بچوں کی تعداد ایک مقررہ حد سے نہ بڑھنے پائے۔ مزید برآں آیہ مذکورہ بالا میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر کسی مسلمان کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ دو بیویوں کے مابین عدل نہ کر سکے گا تو اسے صرف ایک ہی بیوی کرنی ہوگی۔ آگے چل کر چوتھی سورۃ کی (۱۲۹) ویں آیت میں خدائے علیم و خبیر نے واضح فرمایا ہے کہ بیویوں کے مابین عدل کرنا انسان کے بس کی بات ہی نہیں۔

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ
فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا (۱۲۹)

تم اپنی طرف سے کتنے ہی خواہشمند ہو لیکن یہ بات تمہارے بس کی نہیں کہ تم عورتوں میں (جذباتی) عدل کر سکو۔ پس ایسا نہ کرو کہ کسی ایک ہی طرف جھک پڑو اور دوسروں کو اس طرح چھوڑ بیٹھو گویا معلقہ ہے۔ اور اگر تم درستگی پر رہو اور بے انصافی سے بچو تو اللہ غفور و رحیم ہے۔

پس یہ اسٹیٹ کا کام ہے کہ ان دونوں آیتوں کی ہم آہنگی کے ساتھ قانون بنائے اور ایک سے زیادہ بیویاں کرنے پر قیود عاید کر دے۔

۱۰۔ اس قانون میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ برس ہا برس کا تجربہ شاہد ہے اور جیسا کہ خود کلام مجید میں مانا گیا ہے دو بیویوں میں عدل کرنا ممکن نہیں ۱؎ ہے اس لئے تعدد ازدواج قطعاً ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔ ان تینوں آیات میں صرف

۱؎ ہماری بصیرت کے مطابق قرآن نے یہ کہا ہے کہ تم جذباتی عدل پر قادر نہیں ہو سکتے اس لئے ہم تم سے یہ مطالبہ تو نہیں کرتے کہ تم ہر ایک بیوی کو ایک جیسا چاہو۔ لیکن یہ بھی تو نہ کرو کہ کسی ایک کی طرف اتنا جھک جاؤ کہ دوسری ادھر لٹکی رہ جائے۔ اگر تم اس قسم کا عادلانہ سلوک بھی نہیں کر سکتے تو پھر (ہنگامی حالات میں بھی) ایک سے زیادہ بیویاں نہ کرو۔ ایک ہی پر اکتفا کرو۔ قرآن اپنے کسی حکم کو ناممکنات سے مشروط نہیں کرتا۔ (طلوع اسلام)

عام اصول بیان ہو سکے ہیں۔ ان اصولوں کا اطلاق اسٹیٹ کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے جو اس قسم کا قانون بنائے جس سے وہ لوگ جو ایک سے زیادہ بیویاں کر کے تباہی مول لیتے ہیں خود بھی ہلاکت سے بچ جائیں اور ان کے بچے بھی۔ عند الضرورت ازدواج پر کنٹرول کرنا خود ملک اور قوم کے مفاد کے لئے بھی ضروری ہے۔

سرقہ کی مثال

۱۹- اب سرقہ پر غور کیجئے۔ پانچویں سورۃ کی (۳۸) ویں آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ مرد یا عورت جو بھی سرقہ کے مرتکب ہوں اس کی پاداش میں ان کے ہاتھ کٹوا دیئے جائیں بطور ایسی تعزیر کے جو عبرت کے لئے منجانب اللہ مقرر ہوئی ہے۔ اور اسی سورۃ کی (۳۹) ویں آیت کا حکم ہے کہ جو کوئی اس جرم کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرے، تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس پر عفو و مہربانی کی نظر ڈالے گا۔ پس یہ ایک عام اصول ہے کہ سرقہ کی انتہائی سزا قطع ید ہے۔ لیکن سرقہ کیا ہے اور کس قسم کے سرقہ کی پاداش میں یہ سزا دی جانی چاہیئے اس کا تعین کرنا اسٹیٹ کا کام ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لوگوں کے کردار و عمل کے متعلق قرآن شریف کے احکام کی بنا پر قواعد مرتب کرنے کا اختیار اسٹیٹ کو حاصل ہے۔ یہ اختیارات بہت وسیع ہیں اور ایک منصوبہ کے تحت پروگرام کو روبعمل لانے کے لئے ان کا آزادی سے استعمال ہونا چاہیئے۔

نابالغوں سے متعلق قوانین

۲۰- جہاں تک نابالغین کا تعلق ہے ان تمام کتابوں میں جو ہندوستان اور پاکستان میں مستند کتب قانون شرع کا درجہ رکھتی ہیں جو اصول بتلائے گئے ہیں وہ قرآن شریف سے ماخوذ نہیں ہیں۔ اس صحیفہ مقدس کے چند احکام جو نابالغوں سے متعلق ہیں یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

[اس کے بعد فاضل جج نے آیات (۲/۲۳۳) اور (۶۵/۶) درج کی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ]

ان آیات کی رو سے ماؤں کو دو سال تک اپنے بچوں کو دودھ پلانا ہوتا ہے اور باپ کو بچوں کے اور ماں کے جو دودھ پلاتی ہے، خائناً دونوں کے مصارف کا کفیل ہونا پڑتا ہے۔ اسی سے فقہ امامیہ نے یہ تائید لی ہے کہ لڑکا دو سال تک ماں کی تحویل میں رہے لیکن اس بارے میں لڑکے اور لڑکی میں جو فرق کیا جاتا ہے، مجھے قرآن کریم سے اس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ملی۔ قرآن شریف نے ہر دو والدین پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ اپنے بچے کی نگہداشت اور پرورش کریں نہ تو ماں کو بچہ سے محروم کیا جا سکتا ہے نہ باپ کو۔ بہر حال کلام مجید میں یہ کہیں نہیں کہ اگر ماں کسی ایسے شخص سے عقد کرے جو اس نابالغ لڑکی کا محرم نہیں تو اسے اپنی بچی سے چھڑا دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی عورت کو اس کے بچے کی مصاحبت یا معیت سے اس بنا پر محروم کرایا جا سکتا ہے کہ اس نے کسی ایسے شخص سے عقد کر لیا ہے جو نابالغ لڑکی کا محرم رشتہ دار نہیں، تو اسی استدلال کی بنا پر میں نہیں سمجھتا کہ وہ باپ جس نے دوسرا عقد کر لیا ہے اپنے بچہ کی تحویل سے کیوں محروم نہ کر دیا جائے سوتیلی ماں بھی آخر بچہ کے لئے، زیادہ نہیں تو کم از کم اتنی ہی نفور انگیز اور خطرناک ہے جیسے کہ سوتیلا باپ۔ بہر حال یہ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ نابالغوں کے متعلق کوئی قانون مرتب کرے کیونکہ قرآن مجید اس بارے میں خاموش ہے۔ موجودہ

قانونِ ولایت (GUARDIAN AND WARDS' ACT) کے متعلق سمجھنا چاہیئے کہ یہی نابالغوں کا قانون ہے۔ اس کا نفاذ اسلامی ریاست پاکستان کے وجود میں آجانے کے بعد اس ملک کے منتخب نمایندوں کے ہاتھوں ہوا لیکن اس قانونِ ولایت نے بھی کوئی واضح اور معین قاعدہ اس بارے میں مدوّن نہیں کیا کہ اگر ماں دوسرا شوہر کرے تو نابالغ کس کی تحویل میں رہے گا۔ اس باب میں وہ واحد نقطہ جسے قرآن شریف کی رو سے اور قانونِ ولایت کے لحاظ سے ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ یہ ہے کہ نابالغ کی بہبود کا تقاضا کیا ہے۔ اگر ماں کی تحویل میں اس کا رکھا جانا اُس کے حق میں مفید ہے تو باوجود دوسرا عقد کر لینے کے، بچہ اسی کی تحویل میں رکھا جانا چاہیئے۔ اس امر کا تصفیہ ہر مقدمہ کے لحاظ سے ہوگا، یا حالات متعلقہ کی روشنی میں ہوگا۔

اہلِ مسلمانوں کا ایک معتد بہ طبقہ قرآن شریف کے علاوہ حدیث اور سُنت کو بھی قرآن شریف ہی کی طرح ایک اہم

احادیث کی قانونی حیثیت

ماخذِ قانونِ اسلامی تصور کرتا ہے۔ صحیح مفہوم میں حدیث قول ہے حضرت پیغمبر صلعم کا لیکن عام استعمال میں ہر وہ بات حدیث میں داخل ہے جو حضرت رسول صلعم نے کہی یا کیا یا جس پر اُنھوں نے عمل فرمایا۔ جسے انھوں نے پسند یا ناپسند فرمایا۔ اور مستحسن یا غیر مستحسن سمجھا۔ یہ اچھی طرح سمجھنے کے لئے کہ حدیث کس حد تک قانونِ اسلامی کا منبع ہے۔ ہمیں حضورِ سرورِ کائنات کی ذاتِ گرامی کا اسلامی دنیا میں صحیح مقام متعین کر لینا چاہیئے۔ میں اس فیصلہ کے ابتدائی حصہ میں کہہ چکا ہوں کہ مذہب اسلام منجانب اللہ ہے اس کی اشاعت خدائے ذوالجلال اور صرف خدائے ذوالجلال کی طرف سے ہے۔ اگر اسلام کے متعلق یہ تصور صحیح ہے تو لازمًا یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ حضرت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول، عمل اور روش کو وحی خداوندی کے ساتھ مخلوط نہیں کرنا چاہیئے۔ زیادہ سے زیادہ ہو سکتا ہے کہ متعلقہ حالات کی روشنی میں احکامِ قرآن شریعت کی تعبیر کرتے وقت یا قرآن شریف کے عام اصولوں کا کسی خاص مقدمہ زیرِ غور کے واقعات پر اطلاق کرتے وقت اُن سے مدد لی جائے۔ اس سے یقینًا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت محمد صلعم ایک انسانِ کامل تھے۔ ہم میں سے کس کو دعوےٰ ہو سکتا ہے کہ آپؐ کی عظمت و شان کا کما حقہٗ احترام کر سکے یا جس قدر حضورؐ کی عزت و توقیر ہم کرنا چاہتے ہیں وہ مکمل طور پر کر سکیں۔ بایں ہمہ وہ خدا نہیں تھے اور نہ خدا سمجھے جا سکتے تھے۔ دوسرے پیغمبروں کی طرح آپؐ بھی انسان ہی تھے۔

حضورؐ کی بشری حیثیت

[اس کے بعد فاضل جج نے قرآن کریم کی حسب ذیل آیات درج کی ہیں جن میں حضورؐ کی بشریت کا اعلان ہے۔ ۴۱/۶ ؛ ۱۸/۱۱۰ ؛ ۱۷/۹۳ ؛ ۳/۱۴۴ ؛ ۶/۵۰ ؛ ۷/۱۸۸ ؛ ۱۲/۱۰۹ اس کے بعد لکھا ہے]

انھیں بھی ہماری ہی طرح احکامِ خداوندی کی تعمیل کرنی ہوتی تھی۔ اس فرق کے ساتھ کہ قرآن شریف کے تحت اُن کے فرائض اور ذمہ داریاں شاید ہم سے بہت زیادہ تھیں۔ جو کچھ حضورؐ کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتا تھا، آپ اس سے زیادہ مسلمانوں کو کچھ اور نہیں دیتے تھے۔ سورۃ المائدہ میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٦٧﴾

اے رسول! جو کچھ تیرے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے تو اسے (لوگوں تک) پہنچا دے۔ اگر تو ایسا نہ کرے گا (تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ) تو نے خدا کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ اللہ کافروں کو راہ نہیں دیتا۔

۲۲۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ حضرت محمد صلعم کی ذات گرامی کو باوجود اتنی رفعت و شان کے خدا کے بعد ہی کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ مجھے قرآن شریف کی مختلف آیات کا نقل کرتے چلے جانا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو کچھ حضور پر بذریعہ وحی نازل ہوا تھا اس کے علاوہ، ایک انسان کی حیثیت سے آپ کے اپنے خیالات بھی تھے۔ جو آپ کے اعمال کی راہ نمائی کرتے تھے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ حضرت محمد صلعم سے کوئی معصیت سرزد نہیں ہوئی۔ لیکن غلطی کا ارتکاب، آپ سے ہو سکتا تھا۔ اور یہ حقیقت قرآن شریف میں بھی تسلیم کی گئی ہے۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ﴿٢﴾

تاکہ معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہو چکے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے۔ اور پورا کر دے تجھ پر اپنا احسان اور چلائے تجھ کو سیدھی راہ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

حضورؐ کا اسوۂ حسنہ

قرآن مجید کے ایک سے زیادہ مقامات پر یہ ارشاد ہے کہ رسول صلعم کی ذات گرامی ساری دنیا کے لئے اچھا نمونہ ہے لیکن اس کا مطلب اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ہر شخص کو ایسا ہی دیانت و امانت کا حامل، ایسا ہی مستقل مزاج و راسخ۔ ایسا ہی مخلص اور ایسا ہی پارسا و پاکباز ہونا چاہیئے جیسے کہ حضور اکرمؐ تھے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ ہم وہی سوچیں اور وہی کریں جو آپ نے سوچا اور آپ نے کیا۔ کیونکہ یہ ایک خلاف فطرت اور انسان کے لئے ناممکن بات ہے اور اگر ہم اس کی کوشش میں لگ جائیں تو بینا و بصیر ہو جائے۔

۲۳۔ یہ بھی صحیح ہے کہ قرآن مجید نے اطاعتِ رسول پر بہت زور دیا ہے لیکن اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ نے جس کام کو جس خاص طریق سے کرنے کی ہدایت فرمائی ہے ہم اسی نہج سے اسے انجام

اطاعتِ رسول

دیتے رہیں اطاعت صرف حکم (COMMAND) ہی کی ہو سکتی ہے اور جہاں کوئی حکم نہیں ہے اطاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ نافرمانی کا۔ قرآن شریف کے ان احکام سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ ہمیں من و عن وہی کچھ کرنا چاہیئے جو رسول اللہؐ نے کیا۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کسی ایک شخص کی حیات کے زمانہ کا تجربہ، خواہ وہ حضرت رسولؐ کی حیات طیبہ ہی کیوں نہ ہو، زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ حضورؐ کو اسلام نے خدا کا درجہ

نہیں دیا)، چند محدود اشکال کی حد تک ہی نظائر و امثال فراہم کر سکتا تھا ۔ اور یہ بالکل مبرہن ہے کہ قرآن شریف اور حدیث کا فرق ٹھوس اور واضح ہے ۔ اندریں حالات خاص حالات میں ہر قوم کے عمل کرنے کے لئے کونسی چیز قانون متصور ہو اور کس طور پر کسی مقدمہ کا فیصلہ کیا جائے، یہ ایسے سوالات ہیں جن کا تصفیہ حالاتِ پیشِ نظر اور اصولِ انصاف کے تحت ہی ہونا چاہیئے ۔

(اس کے بعد فاضل جج نے قرآن کریم کی تین آیات درج فرمائی ہیں پہلی (۴/۵۸) جس میں حکم دیا گیا ہے کہ امانات ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں ۔ دوسری (۵/۴۲) جس میں حضورؐ سے کہا گیا ہے کہ لوگوں میں عدل و انصاف کی رو سے فیصلے کیا کرو ۔ اور تیسری (۴۲/۱۵) جس میں حضورؐ کی لسانِ مبارک سے کہلوایا گیا ہے کہ مجھے عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ اس کے بعد لکھا ہے :)

افراد، نیز پوری قوم کے معاملات میں کوئی فیصلہ کن رائے قایم کرتے وقت ہم مواقع کے اختلافاتِ زمان و مکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے ۔

خلفائے راشدینؓ کا مسلک دربارۂ حدیث

خلفائے اربعہؓ نے جو رسولؐ کے بعد آئے حضورؐ کے اقوال، اعمال اور طریق کار کو کس قدر اہمیت دی اس کی کوئی مستند شہادت موجود نہیں ۔ لیکن بحث کی خاطر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ افراد کے اور نیز قومی اہمیت کے معاملات کے تصفیوں میں اپنی رہبری کے لئے انھوں نے احادیث رسولؐ سے بہت وسعت کے ساتھ مدد لی تو یہ اُن کے لئے درست بھی تھا کیونکہ وہ زمان و مکان کے اعتبار سے بہ نسبت ہمارے رسول اللہؐ سے زیادہ قریب تھے ۔

لیکن امام ابوحنیفہؒ نے جو ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ستر سال بعد فوت ہوئے پیش آمدہ مسائل کے تصفیوں میں صرف سترہ یا اٹھارہ حدیثوں سے مدد لی ہے ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ رسول اللہؐ سے اتنے قریب نہیں تھے جتنے کہ پہلے چار خلفائے راشدینؓ ۔ انھوں نے تمام معاملات میں قرآن شریف کے احکام پر اپنے تصفیوں کو مبنی کیا اور متن کلام مجید کی تہہ میں جا کر احکام متعددہ کی غایت دریافت کرنے کی سعی کی ۔ استدلال و استخراج کی ان میں بڑی صلاحیت تھی ۔ انھوں نے جورس پروڈنس (اصول قانون) کے نظریئے اور حقیقی واقعات حاضرہ کی روشنی میں قیاسی استخراج کی بنیاد پر اصول ترتیب دیئے ۔ اگر امام ابوحنیفہؒ کو حدیثوں کی مدد کے بغیر احکام قرآنی حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں

امام اعظمؒ اور حدیث

قیاسی استخراج کی بنیاد پر اصول ترتیب دیئے ۔ اگر امام ابوحنیفہؒ کو حدیثوں کی مدد کے بغیر احکام قرآنی کی حالات حاضرہ کی روشنی میں تعبیر کا حق حاصل تھا تو اس حق سے باقی مسلمان محروم نہیں کئے جا سکتے ۔ قرآن شریف کی تعبیر اور انفصال مقدمات میں امام ابوحنیفہ کے فتاویٰ کو خود ان کے شاگرد اور متبعین نے حرفِ آخر نہیں تصور کیا آخر وہ انسان ہی تھے اور ان سے بھی غلطی ہو سکتی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کو صرف ایک شخص کی رائے پر انحصار نہیں کرنا چاہیئے ۔ قوم اپنے زمانے میں اسی رائے اور قانون کی پابند ہوگی

جو عوام کے منتخبہ نمائندگان کی آرا کے نتیجہ پر پہنچے ہوئے۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور اس کو بنیاد قرار دیا تھا کہ معاشرہ کے لئے جن قوانین و ضوابط کی ضرورت ہے ان میں سے چند ہی ایسے ہیں جنہیں قرآن شریف نے متعین طور پر دیا ہے۔ لیکن ان کے بعد آنے والوں میں سے بعض نے (خود امامؒ کے مسلک کے خلاف) یہ قرار دیا کہ ہر قانون جو اخذ کیا گیا ہے قرآن شریف کے متن میں موجود ہے۔ انہوں نے استدلال کے ذریعے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ جو کچھ قرآن کے متن میں موجود تھا اسے اخذ کر لیا جائے۔ یہ ایک شدید نزاعی بحث ہے جس پر میں رائے زنی کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اب جبکہ ہم ایک باقاعدہ اور منظم دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور تجسس و تحقیق طلبانہ کے سائنسی وسائل پر دسترس رکھتے ہیں، وقت آگیا ہے کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ مسلم جورس پروڈنس کی ایک اصل ہونے کی جہت سے حدیث کا مقام کیا ہے۔ نیز یہ بھی کہ آیا اہم مسائل قانونی میں امام ابو حنیفہؒ وغیرہم جیسی عظیم متقن ہستیوں کی رائے کے پابند رہیں یا ہمیں بھی حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں قیاسی استخراج کا حق حاصل ہے۔

۵۔ تمام علمائے اسلام اس پر متفق ہیں کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا موضوع حدیثوں کا ایک بڑا ذخیرہ قوانینِ اسلام کے صحیح ماخذ کی حیثیت حاصل کرتا گیا خود حضرت رسول اکرمؐ کی زندگی میں جھوٹی حدیثیں وضع ہونے لگ گئی تھیں۔ پھر جھوٹی اور غلط حدیثوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں روایتِ حدیث کی ہمت شکنی ہی نہیں کی بلکہ اس کو بند کرا دیا۔ امام بخاریؒ نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف نو ہزار[1] کو صحیح روایات قرار دیا۔ میرے خیال میں اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جس طرح رسول اللہ کی زندگی میں قرآن کریم کی صحت و حفاظت کا انتظام کیا گیا تھا۔ حدیث کی صحت و حفاظت کے لئے اس قسم کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس ایسی شہادت موجود ہے کہ رسول اللہؐ نے تحفظ و روایتِ حدیث کو سخت ناپسند فرمایا۔ اگر مسلم کا مرتبہ مجموعہ احادیث صحیح ہے تو یقیناً رسول اللہؐ نے لوگوں کو آپؐ کے اقوال و اعمال کے لکھنے کی سخت ممانعت فرمائی تھی اور جن لوگوں نے حدیثیں جمع کر رکھی تھیں انہیں فوراً تلف کر ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ "لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا ولا حرج"

مولانا محمد علی نے اپنی کتاب ریلیجن آف اسلام (RELIGION OF ISLAM) (مطبوعہ ۱۹۳۶ء) کے صفحہ ۶۲ پر اسی حدیث یا اسی قسم کی کسی اور حدیث کا حسبِ ذیل ترجمہ دیا ہے۔

(حضرت) ابو ہریرہؓ سے روایت کی جاتی ہے۔ ایک دفعہ ہمارے پاس رسول اللہ تشریف لائے۔ اس وقت ہم حدیث لکھنے میں مصروف تھے۔ آپ نے استفسار فرمایا کہ تم کیا لکھ رہے ہو۔ ہم نے جواب دیا کہ حدیث جو آپ سے ملتی ہے۔ آپ نے حیرت و استعجاب سے فرمایا کیا کلام اللہ کو چھوڑ کر دوسری کتاب! اس کی بھی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ رسول اللہ کے بعد خلفائے اربعہؓ کے عہد میں حدیثیں جمع یا مرتب کی گئیں۔ اس حقیقت کو (کہ احادیث نہ رسول اللہ کے زمانہ میں جمع و مرتب کی گئیں اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ کے عہد میں) کس قدر اہمیت دینی چاہیئے، بڑا غور طلب سوال ہے۔ کیا ایسا کہنا

[1] ترتیب چھ ہزار کو۔ وہ بھی مکررات سمیت۔ طلوعِ اسلام

ممکن ہے کہ رسول اللہؐ نے یا اُن چار خلفاء نے جو آپؐ کے بعد ہوئے تحفظ حدیث کی کوئی کوشش اس لئے نہیں فرمائی کہ وہ عام اطلاق کے لئے متعلق ہی نہیں۔ اکثر مسلمانوں نے قرآن شریف کو حفظ کر لیا تھا۔ جیسے جیسے اُس کا نزول ہوتا اُسے کسی موزوں چیز (از قسم قرطاس) پر فوراً لکھ لیا جاتا۔ اور اس کام کے لئے رسول اللہؐ نے ذہین عالم و فاضل صحابہؓ کی خدمات حاصل فرمائیں۔ لیکن جہاں تک حدیثوں کا تعلق ہے نہ تو وہ کبھی حفظ کرائی گئیں اور نہ انھیں جمع یا محفوظ کیا گیا۔ وہ لوگوں کے سینوں ہی میں پوشیدہ رہیں جنہوں نے مرتے وقت سرسری طور پر دوسروں سے اس کی روایت کر دی تا آنکہ رسولؐ اللہ کی وفات کے کئی صدیوں بعد انھیں جمع اور مدون کیا گیا۔ میری رائے میں تقاضائے وقت یہ ہے کہ اس کی ایک منظم و محققانہ جانچ پڑتال کرائی جائے۔ عربوں کی غیر معمولی اور حیرت انگیز قوت حافظہ کے باوجود جسے انھوں نے بڑے اوج کمال تک پہنچا یا تھا آیا یہ ممکن ہے کہ حدیثوں کو جیسی کچھ وہ موجود ہیں، بالکلیہ قابل اعتماد اور صحیح مانا جائے؟ یہ تسلیم کیا جاتا ہے

احادیث کے مجموعے

کہ پہلی مرتبہ ان کی تدوین رسول اللہؐ کی وفات کے تقریباً سو سال بعد ہوئی تھی لیکن اس کا اب کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔ ازاں بعد امام بخاری (المتوفی ۲۵۶ھ) امام مسلم (المتوفی ۲۶۱ھ) ابوداؤد (المتوفی ۲۷۵ھ) جامع ترمذی (المتوفی ۲۷۹ھ) سنن نسائی (المتوفی ۳۰۳ھ) سنن ابن ماجہ (المتوفی ۲۷۳ھ) سنن الدریمی (المتولد ۱۸۱ھ) بیہقی (المتولد ۳۸۴ھ) اور امام احمد (المتولد ۱۶۴ھ) نے اپنے اپنے مجموعے مرتب کئے۔ اہل تشیع اُن مجموعوں کو مستند تصور کرتے ہیں جو امام ابو جعفر (۳۲۹ھ) شیخ علی (۳۸۱ھ) شیخ ابو جعفر محمد ابن علی ابن حسین (۴۶۰ھ) اور سید الرازی (۴۰۶ھ) نے مرتب کئے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ یہ سارے مجموعے امام بخاری وغیرہم کے مجموعوں کے بھی بہت بعد کے ہیں۔ ایسی حدیثیں بہت کم ہیں جن پر سارے جامعین حدیث متفق ہوں۔ کیا اس حقیقت واقعی سے حدیث کی صحت اور اعتماد مشتبہ نہیں ہو جاتا؟ جن اصحاب کو اس کی تحقیق کا کام سپرد کیا جائے وہ یقیناً اس بات کا خیال رکھیں گے کہ ہزاروں لاکھوں جھوٹی اور موضوع حدیثیں اس نیت سے رائج کر دی گئی ہیں کہ رسول اللہؐ اور اسلام بدنام ہوں۔ انھیں اس بات کا بھی ضرور لحاظ رکھنا ہوگا کہ ایک عرب کی قوت حافظہ کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو، آیا کوئی تحریر جو صرف ان کے حافظہ کے ذریعہ منضبط کی گئی ہو مستند اور معتبر کی جانی چاہیئے؟ آجکل کے عربوں کو بھی اتنا ہی قوی الحافظہ ہونا چاہیئے جتنا تیرہ سو برس پہلے تھا۔ اس لئے اگر موجودہ زمانہ کے عربوں کے حافظہ کا جائزہ لیا جائے تو اس سے اس امر کی نشاندھی ہو جائے گی کہ جو احادیث ہم تک پہنچی ہیں انھیں صحیح اور اصلی تصور کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ عربوں کی مبالغہ آمیزی اور ان لوگوں کے معتقدات و تعصبات نے جنہوں نے ہم تک یہ روایتیں پہنچائی ہیں، اصل روایات کو بڑی حد تک مسخ کر دیا ہوگا۔ جب الفاظ ایک ذہن سے دوسرے ذہن کی طرف منتقل ہوتے ہیں تو ذہن خواہ اہل عرب کا ہو یا کسی اور کا، ان میں ہر شخص کی مخصوص ذہنیت کے لحاظ سے تغیر کا امکان رہتا ہے۔ ہر ذہن اس میں کچھ نہ کچھ توڑ مروڑ کرتا ہے اور جب روایات

متعدد اشخاص کے اذہان سے ہوکر گذریں تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں کیا کچھ تغیر و تبدل نہ ہوگیا ہوگا۔ پھر یہ حقیقت بھی نظرانداز نہ ہونی چاہیئے کہ فطرتِ انسانی ہر جگہ ایک ہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو ناقص النسیان بنایا ہے اور انسان کی قوتِ مدرکہ بھی بجید کمزور ہے۔

چند احادیث بطور مثال

۲۶۔ حدیثوں کے مجموعے جیسے کچھ ہیں ان کا مطالعہ کرنے سے ان میں داخلی شہادت اس امر کی پائی جاتی ہے کہ بعض پر بمشکل اعتبار ہو سکتا ہے بعض احادیث ایسی ہیں جنہیں بمشکل صحیح مانا جاسکتا ہے۔ مثلاً[1]

عَنْ عَطَاءٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى عَائِشَةَ فَقُلْتُ اَخْبِرِيْنَا بِاَعْجَبِ مَا رَاَيْتِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَكَتْ وَ قَالَتْ وَ اَيُّ شَاْنِهٖ لَمْ يَكُنْ عَجَبًا۔ اَتَانِيْ فِيْ لَيْلَةٍ فَدَخَلَ مَعِيْ فِيْ فِرَاشِيْ (اَوْ قَالَتْ فِيْ لِحَافِيْ) حَتّٰى مَسَّ جِلْدِيْ جِلْدَهٗ ثُمَّ قَالَ يَا ابْنَةَ اَبِيْ بَكْرٍ ذَرِيْنِيْ اَتَعَبَّدُ لِرَبِّيْ۔ قُلْتُ اِنِّيْ اُحِبُّ قُرْبَكَ لٰكِنِّيْ اُوْثِرُ هَوَاكَ فَاَذِنْتُ لَهٗ، فَقَامَ اِلٰى قِرْبَةِ مَاءٍ فَتَوَضَّاَ فَلَمْ يُكْثِرْ صَبَّ الْمَاءِ ثُمَّ قَامَ يُصَلِّيْ فَبَكٰى حَتّٰى سَالَتْ دُمُوْعُهٗ عَلٰى صَدْرِهٖ ثُمَّ رَكَعَ فَبَكٰى ثُمَّ سَجَدَ فَبَكٰى ثُمَّ رَفَعَ رَاْسَهٗ فَبَكٰى فَلَمْ يَزَلْ كَذٰلِكَ يَبْكِيْ حَتّٰى جَاءَ بِلَالٌ فَاٰذَنَهٗ بِالصَّلٰوةِ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا يُبْكِيْكَ وَ قَدْ غَفَرَ اللّٰہُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ؟ قَالَ اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا۔

حضرت عطاءؓ سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں پہنچا اور ان سے کہا کہ آپ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے زیادہ عمدہ و عجیب کام جو آپ نے دیکھا ہو اس سے مطلع فرمایئے۔ اس پر وہ رو پڑیں اور فرمانے لگیں ان کا تو ہر کام ہی عمدہ و پسندیدہ اور تعجب انگیز ہوتا تھا۔ آپؐ ایک شب میرے پاس آئے اور میرے ساتھ میرے بچھونے (یا لحاف) میں آگئے حتیٰ کہ میرا بدن آپ کے بدن سے مس کرنے لگا، پھر آپ نے فرمایا، "اے بنت ابی بکرؓ! مجھے میرے رب کی عبادت میں لگ جانے دو۔" میں نے کہا "مجھے آپ کا قرب محبوب ہے لیکن میں اسے آپ کی مرضی پر ترجیح دیتی ہوں، چنانچہ میں نے آپ کو اجازت دیدی۔ آپؐ پانی کی مشک کے پاس تشریف لے گئے، پھر وضو کیا، آپ نے زیادہ پانی

---

[1] ان احادیث کے لئے فاضل جج نے مشکوٰۃ ایڈیشن سنہ ۱۹۳۶ء کا حوالہ دیا ہے۔ اصل فیصلہ میں صفحات وغیرہ سب درج ہیں۔

نہ گرایا، پھر آپؐ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اور آپ رونے لگے تا آنکہ آپ کے آنسو آپ کے سینہ پر رواں ہو گئے پھر رکوع فرمایا اور روتے رہے۔ پھر سجدہ کیا اور روتے رہے۔ پھر اپنا سر اٹھایا اور روتے رہے پھر آپؐ برابر روتے رہے حتیٰ کہ حضرت بلالؓ نے آکر انہیں نماز کے وقت کی اطلاع دی۔ تب میں نے پوچھا یا رسول اللہ! اللہ نے تو آپ کے اگلے اور پچھلے قصور معاف فرما دیئے ہیں آخر پھر آپ کیوں روتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا تو کیا میں اس کے ان عظیم انعامات پر اس کا انتہائی شکرگذار بندہ نہ بنوں۔

⁂

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يُقَبِّلُ بَعْضَ أَزْوَاجِهِ ثُمَّ يُصَلِّيْ وَ لَا يَتَوَضَّأُ

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعض ازواج مطہرات کو بوسہ کرتے تھے پھر بغیر وضو کئے نماز پڑھ لیتے تھے۔

⁂

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَتْ أُمُّ سُلَيْمٍ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ، فَهَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ مِنْ غُسْلٍ إِذَا احْتَلَمَتْ؟ قَالَ نَعَمْ، إِذَا رَأَتِ الْمَاءَ۔ فَغَطَّتْ أُمُّ سَلَمَةَ وَجْهَهَا وَ قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَوَ تَحْتَلِمُ الْمَرْأَةُ؟ قَالَ نَعَمْ تَرِبَتْ يَمِيْنُكِ فَبِمَ يُشْبِهُهَا وَلَدُهَا، مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ، وَ زَادَ مُسْلِمٌ بِرِوَايَةِ أُمِّ سُلَيْمٍ إِنَّ مَاءَ الرَّجُلِ غَلِيْظٌ أَبْيَضُ وَ مَاءَ الْمَرْأَةِ رَقِيْقٌ أَصْفَرُ، فَمِنْ أَيِّهِمَا عَلَا أَوْ سَبَقَ يَكُوْنُ مِنْهُ الشَّبَهُ

حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ ام سلیمؓ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ بلاشک اللہ تعالیٰ حق میں حجاب روا نہیں رکھتا۔ تو بتایئے کہ کیا اگر عورت کو احتلام ہو جائے تو وہ بھی غسل کرے گی؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں، جبکہ وہ تر مادہ دیکھے۔ اس پر ام سلمہؓ نے اپنا چہرہ ڈھانک لیا۔ اور پوچھا، یا رسول اللہ کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ " آپؐ نے فرمایا ہاں، ورنہ پھر اس کا بچہ اس پر کیوں جاتا ہے؟ یہ بخاری و مسلم کی روایت ہے۔ مسلم نے ام سلیم کی روایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ بے شک مرد کا مادہ گاڑھا اور سفید ہوتا ہے اور عورت کا مادہ پتلا اور پیلا ان میں سے جو غالب آجاتا ہے یا پہلے ہو جاتا ہے اسی کے مطابق اولاد میں مشابہت ہوتی ہے۔

⁂

عَنْ مُعَاذَةَ قَالَتْ قَالَتْ عَائِشَةُ كُنْتُ أَغْتَسِلُ[1] أَنَا وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مِنْ إِنَاءٍ وَاحِدٍ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهُ فَيُبَادِرُنِيْ حَتّٰى أَقُوْلَ دَعْ لِيْ دَعْ لِيْ قَالَتْ وَ هُمَا جُنُبَانِ

حضرت معاذہؓ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے جو میرے اور آپ کے درمیان تھا غسل کر رہے تھے۔ آپ تیزی سے اس میں سے پانی استعمال کر رہے تھے اس پر مجھے کہنا پڑا کہ میرے لئے بھی کچھ چھوڑیئے۔ راویہ کہتی ہے کہ وہ دونوں جنبی تھے۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الرَّجُلِ يَجِدُ الْبَلَلَ وَلَا يَذْكُرُ إِحْتِلَامًا، قَالَ يَغْتَسِلُ۔ وَ عَنِ الرَّجُلِ الَّذِيْ يَرٰى أَنَّهُ قَدْ إِحْتَلَمَ وَلَا يَجِدُ بَلَلًا قَالَ لَا غُسْلَ عَلَيْهِ، قَالَتْ أُمُّ سُلَيْمٍ هَلْ عَلَى الْمَرْأَةِ تَرٰى ذَالِكَ غُسْلٌ قَالَ نَعَمْ، إِنَّ النِّسَاءَ شَقَائِقُ الرِّجَالِ

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جو تری پائے لیکن اسے احتلام ہونا یاد نہ ہو۔ تو آپ نے فرمایا کہ وہ غسل کرے گا۔ نیز اس شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جسے احتلام ہوا ہو لیکن اسے تری نظر نہ آئے تو آپ نے فرمایا وہ غسل نہیں کرے گا۔ ام سلیم نے کہا۔ کہ کیا اگر عورت بھی یہی کچھ دیکھے تو اسے بھی غسل کرنا ہوگا۔ آپ نے فرمایا "ہاں، عورتیں مردوں کی بہنیں اور انہی میں سے پھوٹ کر نکلنے والی شاخیں ہیں۔

عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِذَا جَاوَزَ الْخِتَانُ الْخِتَانَ وَجَبَ الْغُسْلُ فَعَلْتُهُ أَنَا وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاغْتَسَلْنَا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب ختنہ ختنہ سے تجاوز کر جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے میں نے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عمل کیا تو ہم دونوں نہائے تھے۔

---

[1] اغتسل (مترجم)

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَغْتَسِلُ مِنَ الْجَنَابَةِ ثُمَّ يَسْتَدْفِئُ بِيْ قَبْلَ اَنْ اَغْتَسِلَ

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنابت کا غسل فرمانے کے بعد میرے بچھونے میں گرم ہونے کے لئے گھس جاتے تھے اور ابھی میں نے غسل بھی نہیں کیا تھا۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَغْتَسِلُ اَنَا وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اِنَاءٍ وَّاحِدٍ وَ كِلَانَا جُنُبٌ وَكَانَ يَاْمُرُنِيْ فَاَتَّزِرُ فَيُبَاشِرُنِيْ وَاَنَا حَائِضٌ، يُخْرِجُ رَاْسَهٗ اِلَيَّ وَهُوَ مُعْتَكِفٌ فَاَغْسِلُهٗ وَاَنَا حَائِضٌ۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے غسل کر لیا کرتے تھے اور ہم دونوں جنبی ہوتے تھے۔ اور وہ مجھے حکم دیتے تھے تو میں ازار باندھ لیتی تھی۔ پھر آپؐ مجھ سے مباشرت فرماتے تھے اور میں حائض ہوتی اور آپؐ اعتکاف میں ہوتے تو اپنا سر میری طرف بڑھا دیتے پھر میں اسے دھوتی اور میں حائض ہوتی تھی

عَنْ عَائِشَةَ كُنْتُ اَشْرَبُ وَاَنَا حَائِضٌ ثُمَّ اُنَاوِلُهُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَضَعُ فَاهُ عَلٰى مَوْضِعِ فِيَّ فَيَشْرَبُ وَاَتَعَرَّقُ الْعَرْقَ وَاَنَا حَائِضٌ ثُمَّ اُنَاوِلُهُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَضَعُ فَاهُ عَلٰى مَوْضِعِ فِيَّ

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میں حائض ہوتی اور اس حالت میں (پانی وغیرہ) پیتی تھی پھر وہ برتن آنحضرتؐ کو دیدیتی اور آپ میرے منہ کی جگہ (برتن میں) اپنا منہ رکھ کر پانی پی لیتے اور میں حالت حیض ہی میں ہڈی پر سے گوشت نوچ کر کھاتی پھر وہ ہڈی حضور کو دیدیتی تو آپؐ اس گوشت والی ہڈی پر اس جگہ منہ رکھتے جہاں میرا منہ لگتا تھا۔

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اِذَا حِضْتُ نَزَلْتُ عَنِ الْمِثَالِ عَلَى الْحَصِيْرِ فَلَمْ يَقْرَبْنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ تَدْنُ[1] مِنْهُ حَتّٰى اَطْهُرَ

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب میں حیض سے ہوتی تھی تو بچھونے سے اتر کر چٹائی پر سونے لگتی تھی۔

---

[1] آدُنْ (مترجم)

تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے قریب نہ ہوتے تھے اور نہ میں آپ سے قریب ہوتی تھی تاوقتیکہ میں نہا نہ لیتی۔

عَنْهَا قَالَتْ قَالَ لِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَاوِلِیْنِیْ الْخُمْرَۃَ مِنَ الْمَسْجِدِ فَقُلْتُ اِنِّیْ حَائِضٌ فَقَالَ اِنَّ حَیْضَتَكِ لَیْسَتْ فِیْ یَدِكِ

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ مسجد سے مجھے جا نماز لا دو۔ تو میں نے کہا "میں حیض میں ہوں" آپ نے فرمایا "تمہارا حیض تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

۲۷۔ کہا جاتا ہے کہ ان احادیث کا نفس مضمون حضرت عائشہؓ صدیقہ اور حضرت ام سلمہؓ کا روایت کیا ہوا ہے۔ میں کسی صورت میں بھی اپنے آپ کو اس بات کے ماننے پر مائل نہیں کر سکتا کہ ان خواتین نے جو ہر نوع کامل الصفات حسنہ تھیں، اس عریاں طریق سے وہ پرائیویٹ باتیں غیروں پر ظاہر کی ہوں گی جو ان کے اور حضرت محمدؐ کے درمیان میاں بیوی کی حیثیت ہوں گی۔

۲۸۔ میں یہ بھی یقین نہیں کر سکتا کہ رسول اللہؐ نے یہ فرمایا ہو کہ دوزخ میں جو لوگ پائے گئے ان میں غالب تعداد عورتوں کی تھی اور جنتی لوگوں میں اکثریت غریبوں مفلسوں کی۔ (جیسا کہ ان احادیث میں آیا ہے)

عَنْ اُسَامَۃَ بْنِ زَیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قُمْتُ عَلٰی بَابِ الْجَنَّۃِ فَکَانَ عَامَّۃُ مَنْ دَخَلَھَا الْمَسَاکِیْنُ وَ اَصْحَابُ الْجَدِّ مَحْبُوْسُوْنَ غَیْرَ اَنَّ اَصْحَابَ النَّارِ قَدْ اُمِرَ بِھِمْ اِلَی النَّارِ وَ قُمْتُ عَلٰی بَابِ النَّارِ فَاِذَا عَامَّۃُ مَنْ دَخَلَھَا النِّسَاءُ

حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت نے فرمایا میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو دیکھا کہ اس میں عام طور پر داخل ہونے والے مساکین ہی تھے اور خوش حال بالنصیب لوگ محبوس تھے پھر جہنم والوں کو آگ میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا تو میں جہنم کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ عام طور پر اس میں داخل ہونے والی عورتیں تھیں۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِطَّلَعْتُ فِی الْجَنَّۃِ فَرَاَیْتُ اَکْثَرَ اَھْلِھَا الْفُقَرَاءَ وَ اطَّلَعْتُ فِی النَّارِ فَرَاَیْتُ اَکْثَرَ

أَهْلِهَا الْفُقَرَاءُ

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا - میں نے جنت کا منظر دیکھا تو اس میں جانے والی کی اکثریت فقیروں کی تھی اور میں نے جہنم کا منظر دیکھا تو ان میں اکثریت عورتوں کی تھی۔

۲۹ - کیا اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمانوں کو من حیث القوم حصول دولت سے منع فرمادیا گیا؟ کیونکہ اگر انھوں نے دولت کمائی تو اُن کے جنت میں جانے کے مواقع کم ہو جائیں گے۔ (ذرا غور تو کیجئے) کہ سب مسلمان مفلس و کنگال ہو جائیں تو ان کی حالت کیا ہو گی؟ کیا افلاس انھیں کلیتاً ہلاک نہ کر ڈالے گا - کیا اس سے زندگی کے تمام میدانوں میں ان کی ترقی نہیں رُک جائے گی؟ مزید برآں کیا یہ تعین کرنے کے قابل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے، حسب روایت عبداللہ بن قیس (مجموعہ احادیث بخاری صفحہ ۵۲، نمبر ۲۸۶/۱۴۲) یہ ارشاد فرمایا کہ مسلمان جنت کی عورتوں (حوران جنت) سے جو خیمہ کے مختلف گوشوں میں بیٹھی ہوئی ہوں گی مباشرت میں مشغول ہوں گے؟ حدیث کی روایتوں اور قرآن کریم کی ان تفاسیر نے جو قدیم زمانہ میں لکھی گئی تھیں، اسلام کو ایک تنگ حلقہ میں مقید کر رکھا ہے اور اس کے دائرہ عمل کو جو بہت وسیع تھا نہایت محدود کر دیا ہے - کیا ہم اس صورتِ حال کو اسی طرح قائم اور جاری رکھیں؟

احادیث حرفِ آخر نہیں ہو سکتیں

۳۰ - بحث کی خاطر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ حدیثیں جو مختلف محدثین نے جمع کی ہیں صحیح اور سچی ہیں، پھر بھی اس حقیقت واقعی کی شہادت موجود ہے کہ یہ حدیثیں مسائل مذہبی سے متعلق نہیں تھیں - نیز ان سے رسول اللہ کا یہ منشا نہ تھا کہ وہ اس بارے میں حرفِ آخر تصور کر لی جائیں - چنانچہ حدیث ذیل مسلم سے مروی ہے :-

عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَهُمْ يَأْبُرُوْنَ النَّخْلَ قَالَ مَا تَصْنَعُوْنَ، قَالُوْا كُنَّا نَصْنَعُهُ قَالَ لَعَلَّكُمْ لَوْ لَمْ تَفْعَلُوْا كَانَ خَيْرًا، فَتَرَكُوْهُ، فَنَقَصَتْ، فَذَكَرُوْا ذَالِكَ لَهُ فَقَالَ اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ اَمْرِ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِيْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ

حضرت رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور یہاں کے لوگ کھجوروں کو بار آور کرنے کے لئے ایک عمل کرتے تھے، آپؐ نے دریافت فرمایا "تم کیا کرتے ہو" انھوں نے جواب دیا "یہ ہم کرتے چلے آئے ہیں" آپؐ نے فرمایا اگر تم یہ نہ کرو تو بہتر ہو سکتا ہے " اس پر لوگوں نے یہ عمل چھوڑ دیا تو پیداوار کم ہو گئی - پھر یہ بات حضورؐ کے سامنے بیان کی گئی، آپ نے فرمایا میں ایک

انسان ہوں، جب تمہیں تمہارے دین کے متعلق کسی بات کا حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب تمہیں اپنی رائے سے کسی بات کا حکم دوں تو خیال رکھو کہ میں ایک انسان ہی ہوں۔

علاوہ ازیں، ایک سے زیادہ حدیثوں میں نبی اکرمؐ نے یہ بات زور دے کر بیان فرمائی ہے کہ قرآن شریف ہی وہ واحد کتاب ہے جس سے مسلمانوں کی زندگی کی ہر منزل میں رہبری ہونی چاہیئے۔

محدثین نے ایسا دعویٰ کبھی نہیں کیا

۳۱۔ یہ حقیقت کہ خود محدثین کو اپنے حدیث کے مجموعوں کی پوری صحت کا کلیتاً اطمینان نہ تھا، صرف ایک بات سے ہویدا ہے کہ وہ مسلمانوں سے یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ وہ ان کی جمع کی ہوئی حدیثوں کو بلا چون وچرا صحیح تسلیم کرلیں۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ وہ جب تک اُن کے مقرر کردہ معیاروں اور کسوٹیوں پر پوری نہ اتریں اُنہیں صحیح تسلیم کیا جائے (ظاہر ہے کہ) اگر انھیں خود صحت کا یقین ہوتا تو ایسی جانچ پڑتال کی مطلقاً ضرورت نہ تھی۔

احادیث اور ترکِ دنیا

۳۲۔ بعض حدیثیں ایسی بھی ملتی ہیں جو انسان کو اس دنیا سے پرے لیجاتی ہیں۔ صاحبِ روحانیت ہونا ایک اچھی بات ہے لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اسے بیہودگی کی حد تک پہنچا دیا جائے۔ اساسی طور پر خدائے تعالیٰ نے ہمیں انسان بنا کر پیدا کیا ہے، اور اس کا منشا بھی یہ ہے کہ ہم انسانوں کی طرح زندگی گذاریں۔ اگر وہ چاہتا کہ ہم اہلِ روحانیت یا فرشتے ہو جائیں تو اس قادرِ مطلق کے لئے اس سے زیادہ آسان بات کیا تھی کہ وہ ہمیں پیدا ہی ایسا کرتا۔ صحیح اسلامی قانون کی رُو سے مسلمانوں کو اپنی توانائیاں زندگی کو زیادہ مفید، زیادہ حسین اور زیادہ خوشگوار بنانے میں صرف کرنی چاہیئے۔

تنقیدِ احادیث کی ضرورت

۳۳۔ حدیثوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگی کہ ان میں سے اکثر مختصر اور بے سروپا (ABRUPT) ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سلسلۂ کلام سے جدا کر لیا گیا ہے، پس تا وقتیکہ پورا سلسلۂ کلام سامنے نہ ہو اور وہ واقعات معلوم نہ ہو جائیں جو پیغمبر صلعم کے کسی قول یا فعل کے محرک ہوئے تھے۔ ان اقوال وافعال کی صحیح اہمیت اور اثر انگیزی کا اندازہ اور فیصلہ کرنا ممکن نہیں۔ بہرحال ضرورت اس امر کی ہے کہ حدیثوں کی بالکل نئی بنیادوں پر مکمل تحقیق اور پوری چھان بین ہو۔ یہ کہا جاتا ہے اور بالکل صحیح طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف کی آیات کو حدیثیں منسوخ نہیں کر سکتیں لیکن کم از کم ایک معاملہ میں تو حدیثوں نے قرآن (کے حکم) کی ترمیم کر دی ہے اور وہ ہے مسلمانوں میں وصیت کا مسئلہ۔ حدیثوں پر نہایت غور کرنے کے بعد میں یہ رائے قایم کرنے پر مجبور ہوں کہ حدیثیں، جیسی کچھ فی الحال موجود ہیں، ہرگز قرآن کے ہم پایہ متصور نہ ہونی چاہئیں اور نہ ہی ان کے متعلق یہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کا اطلاق عام ہو سکتا ہے۔ میں اُن حدیثوں کو جو مختلف جامعین نے مرتب کی ہیں قانون کا ماخذ تصور کرنے کے حق میں نہیں ہوں تا آنکہ تعصب اور تنگ نظری سے نہیں بلکہ نفسِ مضمون کے

اعتبار سے اور سوچ سمجھ کر از سر نو اُن تمام معیاروں پر اُن کی جانچ پڑتال نہ کر لی جائے جو امام بخاریؒ وغیرہم نے بے شمار جھوٹی موضوع، اور من گھڑت حدیثوں کے انبار سے منتخب کرنے میں استعمال کئے تھے، انھیں ان کسوٹیوں پر نہ کس لیا جائے جو ہمیں نئے حالات اور نئے تجربوں سے حاصل ہو چکی ہیں۔ میری یہ بھی رائے ہے کہ جج صاحبان اور عوام کے منتخب نمائندے حالات پیش نظر کی روشنی میں استدلال و قیاس کے لطیف طریقوں سے، قرآن شریف کی تعبیر و تفسیر سے فن شریعہ کو فروغ دیں اور امام ابوحنیفہؒ وغیرہ جیسے مسلم مقننین کے فتاویٰ کو جو مختلف کتابوں میں جمع کئے گئے ہیں، صرف نظائر کی حیثیت سے کام میں لائیں، اسی طرح جیسے عام عدالتی فیصلوں کو نظائر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآن شریعت کا قانون سکونی (جامد) نہیں بلکہ نامیاتی ہے اور اس کی تعبیر بھی انسان کی اس روش کے لحاظ ہی سے ہونی چاہیئے جیسی بھی وہ حالات و ماحول سے متاثر اور مختلف النوع واقعات سے اثر پذیر ہوتی ہے۔

اسلامی قوانین کی تدوینِ نو کی ضرورت

امور دنیوی کی تحقیق میں امام ابوحنیفہؒ کی طرح عقل و بصیرت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اس اسلامی قانون میں جو برصغیر ہند کے مسلمانوں کو ملا ہے بڑی وسیع تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ اسے ملک کے موجودہ حالات اور ماحول سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔

۳۴۔ دوسرا سوال جس پر غور کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ اگر حدیثیں، جیسی کچھ کہ محدثین نے جمع کی ہیں صحیح اور اصلی اور ایسی تصور کر لی جائیں جن کی پابندی مثل احکام قرآنی کے پابندی کے ہو، تو آیا اس قانون کی کتب متداولہ میں نابالغوں کے بارے میں لکھا ہوا ہے، خود حدیثوں میں سند موجود بھی ہے؟

مروجہ قانونِ ولایت کی سند حدیث میں بھی نہیں

۳۵۔ نابالغوں سے متعلق سارا اسلامی قانون جس کو اس فیصلہ کی ابتدا میں نقل کیا جا چکا ہے ایک مشتبہ سی حدیث پر مبنی ہے۔ جس کی احمد اور ابوداؤد نے روایت کی ہے۔ اور جو حسب ذیل ہے۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ امْرَاَةً قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ ابْنِيْ هٰذَا كَانَ بَطْنِيْ لَهٗ وِعَاءً وَ حِجْرِيْ لَهٗ حِوَاءً وَ اِنَّ اَبَاهُ طَلَّقَنِيْ وَ اَرَادَ اَنْ يَّنْزِعَهٗ مِنِّيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اَنْتِ اَحَقُّ بِهٖ مَا لَمْ تَنْكِحِيْ۔

عمرو بن شعیب اپنے باپ اور اپنے دادا کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نے کہا یا رسول اللہ بیشک میرا یہ بیٹا وہ ہے جس کے لئے میرا پیٹ محفوظ خانہ بنا رہا، میری چھاتیاں اس کے لئے غذا بنیں، میری گود اس کا محفوظ مسکن بنی۔ اس کے باپ نے مجھے طلاق دیدی ہے اور اب چاہتا ہے کہ اسے بھی مجھ سے چھین لے تو آپؐ نے فرمایا تا وقتیکہ دوسرا نکاح نہ کرے تو اس بچہ کو اپنے پاس رکھنے کی زیادہ حقدار ہے۔

حکم غیر واضح ہے

۳۲- ہمیں اُن حالات کا علم نہیں جن کے تحت رسول اللہؐ نے اس عورت سے فرمایا کہ وہ اپنے بچہ کو عقد ثانی تک اپنے پاس رکھ سکتی ہے۔ قیاس کی رو سے یہ حکم لڑکی سے بھی متعلق ہونا چاہیئے۔ لیکن اس حدیث کے مطابق ماں اپنے بچہ کی ولایت کا حق زائل کر دیتی ہے۔ اگر وہ نابالغ کے کسی رشتہ دار محرم یا غیر محرم سے عقد ثانی کرلے۔ اس سے تو عقد بیوگان کے حق کے راستے میں ایسی رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے جو قرآن شریف کے احکام اور دوسری حدیثوں کے خلاف ہے۔ پھر اس حدیث سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ماں اگر دوسرا عقد کرے تو نابالغ بچہ آخر کس کے پاس رہے گا۔ اس حدیث سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے یہ ہے کہ ایسی صورت میں بچہ باپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ مگر امام شافعیؒ اس باب میں دوسری طرف "تفریط" تک چلے گئے ہیں۔ اُن کی رائے کے مطابق ماں اپنے نابالغ بچوں کی ولایت کی مستحق ہی نہیں رہتی گو اُس نے اُن کے محرم رشتہ دار ہی سے شادی کیوں نہ کی ہو جبکہ وہ شوہر ایسی ولایت پر راضی نہ ہو۔ دوسرے مستند راویوں نے جو مقابلۃً زیادہ معتبر ہیں رسول اللہؐ سے جو حدیث روایت کی ہے یہ اس کے بھی خلاف جاتی ہے۔ چنانچہ ترمذیؒ نے حضرت ابو ایوبؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا، کہ جو بھی ماں اور بچے میں تفریق کا باعث ہو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُس کے اور اُس کے سب سے پیاروں میں تفریق کروائے گا۔

عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ فَرَّقَ بَیْنَ وَالِدَۃٍ وَ وَلَدِھَا فَرَّقَ اللّٰہُ بَیْنَہٗ وَ بَیْنَ اَحِبَّتِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ

حضرت ابو ایوبؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرتؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص ماں اور اُس کے بچے میں جدائی ڈالے گا اللہ روزِ قیامت اس کے اور اس کے دوستوں کے درمیان جدائی کر دے گا۔

ایک دوسرے موقع پر رسول اللہؐ نے ایک کنیز کی بیع کو اس بناء پر منسوخ فرما دیا کہ اس سے اس کا لڑکا بچھڑ جاتا تھا۔

وَ عَنْہُ اَنَّہٗ فَرَّقَ بَیْنَ جَارِیَۃٍ وَ وَلَدِھَا فَنَھَاہُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ ذٰلِکَ فَرَدَّ الْبَیْعَ۔

انہی سے یہ بھی روایت ہے کہ انھوں نے ایک کنیز اور اس کے بچے کو (فروخت کر کے) ایک دوسرے سے بچھڑا دیا تھا تو آپؐ نے انھیں اس سے منع فرما دیا تو انھوں نے یہ سودا واپس لے لیا۔

جہاں تک لڑکے کا تعلق ہے ابن ماجہ نے ابو موسیٰ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے اس شخص کو ملعون قرار دیا جو لڑکے کو باپ سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کرتا ہے۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ فَرَّقَ بَیْنَ الْوَالِدِ وَ بَیْنَ الْاَخِ وَ بَیْنَ اَخِیْہِ۔

حضرت ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے اس شخص پر لعنت بھیجی ہے جو باپ بیٹے کے درمیان اور

بھائی بھائی کے درمیان جدائی کرتا ہے۔

جہاں رسول اللہؐ نے ماں کو بچہ سے جدا کرنے سے منع فرمایا انھوں نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ ماں کے عقد ثانی کر لینے کی صورت میں یہ جائز ہو جائے گا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کونسی حدیث مقدم ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو کچھ رسول اللہؐ نے بعد میں فرمایا ہو اس سے قول ماقبل منسوخ ہو جائے گا۔ پھر لڑکے کی صورت میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے بالغ ہی کو یہ اختیار دیدیا کہ ماں اور باپ میں سے جس کو چاہے ولایت کے لئے چُن لے۔

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيَّرَ غُلَامًا بَيْنَ اَبِيْهِ وَ اُمِّهٖ

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بچہ کو اختیار دیا کہ وہ چاہے تو اپنے باپ کے ساتھ رہے اور چاہے تو اپنی ماں کے ساتھ رہے۔

ایک اور واقعہ ابوداؤد۔ نسائی۔ اور دارمی نے نقل کیا ہے۔

وَعَنْهُ قَالَ جَاءَتْ اِمْرَاَةٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ اِنَّ زَوْجِيْ يُرِيْدُ اَنْ يَّذْهَبَ بِابْنِيْ وَ قَدْ سَقَانِيْ وَنَفَعَنِيْ۔ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ هٰذَا اَبُوْكَ وَ هٰذِهٖ اُمُّكَ، فَخُذْ بِيَدِ اَيِّهِمَا شِئْتَ فَاَخَذَ بِيَدِ اُمِّهٖ فَانْطَلَقَتْ بِهٖ۔

اُنھیں سے روایت ہے کہ ایک عورت آنحضرتؐ کے پاس آئی اور کہنے لگی، میرا شوہر چاہتا ہے کہ میرے بیٹے کو میرے پاس سے لے جائے حالانکہ وہ میرے لئے پانی لاتا ہے اور دیگر فائدے پہنچاتا ہے، آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "بچے! یہ تیرا باپ ہے اور یہ اماں ہے ان میں سے جس کا تو چاہے ہاتھ پکڑ لے۔ چنانچہ بچے نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ اسے لیکر چلتی بنی۔

۳۷۔ یہی واقعہ شاید کچھ اختلاف کے ساتھ، ابوداؤد۔ نسائی اور دارمی کے مجموعے میں بھی ہے۔

عَنْ هِلَالِ بْنِ اُسَامَةَ قَالَ بَيْنَمَا اَنَا جَالِسٌ مَعَ اَبِيْ هُرَيْرَةَ جَاءَتْهُ اِمْرَاَةٌ فَارِسِيَّةٌ مَعَهَا ابْنٌ لَهَا وَقَدْ طَلَّقَهَا زَوْجُهَا فَادَّعَيَاهُ فَرَطَنَتْ لَهٗ تَقُوْلُ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ زَوْجِيْ يُرِيْدُ اَنْ يَّذْهَبَ بِابْنِيْ فَقَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ اِسْتَهِمَا عَلَيْهِ رَطَنَ لَهَا بِذٰلِكَ، فَجَاءَ زَوْجُهَا وَقَالَ مَنْ يُّحَاقُّنِيْ فِيْ ابْنِيْ فَقَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ لَا اَقُوْلُ هٰذَا اِلَّا اَنِّيْ كُنْتُ قَاعِدًا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَتْهُ اِمْرَاَةٌ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

اِنَّ زَوْجِيْ يُرِيْدُ اَنْ يَّذْهَبَ بِابْنِيْ وَ قَدْ نَفَعَنِيْ وَ سَقَانِيْ مِنْ بِئْرِ اَبِيْ عِنَبَةَ وَ فِيْ النِّسَائِيْ" مِنْ عَذْبِ الْمَاءِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَهِمَا عَلَيْهِ فَقَالَ زَوْجُهَا مَنْ يُّحَاقُّنِيْ فِيْ وَلَدِيْ ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا اَبُوْكَ وَ هٰذِهٖ اُمُّكَ فَخُذْ بِيَدِ اَيِّهِمَا شِئْتَ - فَاَخَذَ بِيَدِ اُمِّهٖ

ہلال ابن اسامہ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر جبکہ میں حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا ان کے پاس ایک ایرانی عورت آئی جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی تھا، اس عورت نے اس کے شوہر کو طلاق دیدی تھی اور میاں بیوی دونوں بچے کے مدعی تھے عورت نے ابوہریرہ سے اپنی فارسی زبان میں کہا "اے ابوہریرہ! میرا شوہر میرے بیٹے کو خود لے لینا چاہتا ہے۔ تو حضرت ابوہریرہؓ نے کہا "تم دونوں اس کے بارے میں قرعہ ڈال لو" یہ عبارت انھوں نے اسی کی زبان میں کہی، اتنے میں اس کا شوہر بھی آگیا اور کہنے لگا "میرے بیٹے کے بارے میں مجھ سے حق کون دلائے گا" تو حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ اللہ جانتا ہے کہ میں یہ جو فیصلہ کر رہا ہوں وہ اس بنا پر ہے کہ ایک موقع پر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور آپ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے کہا یا رسول اللہ میرا شوہر میرے بیٹے کو مجھ سے لے لینا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ میرا کام کرتا ہے اور مجھے ابی عنبہ کے کنوئیں سے پینے کا پانی لاکر دیتا ہے۔ (نسائی کی روایت میں شیریں پانی کا لفظ ہے) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم دونوں اس کے بارے میں قرعہ ڈال لو" تو اس کے شوہر نے کہا میرے بیٹے کے بارے میں مجھے حق کون دلائے گا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے بچے! یہ تیرا باپ ہے اور یہ تیری ماں ہے تو ان دونوں میں سے جس کا ہاتھ چاہے پکڑ لے۔ چنانچہ اس بچے نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

یہ حدیثیں صاف بتلاتی ہیں کہ لڑکے کو ماں باپ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا موقع دیا گیا تھا اور ایسا کوئی اشارہ نہیں کہ ماں اگر عقد ثانی کرے تو یہ حق انتخاب بچہ کو نہیں دیا جائے گا۔

ایک اور حدیث ہے جس میں رسول اللہؐ نے لڑکی، ماں کی بہن (خالہ) کے حوالہ فرمائی کیونکہ ان کی رائے یہ تھی کہ خالہ ماں کی مانند ہے۔

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ صَالَحَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ عَلٰى ثَلَاثَةِ اَشْيَاءَ، عَلٰى اَنَّ مَنْ اَتَاهُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ رَدَّهٗ اِلَيْهِمْ، وَمَنْ اَتَاهُمْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ لَمْ يَرُدُّوْهُ، وَ عَلٰى اَنْ يَّدْخُلَهَا مِنْ قَابِلٍ وَ يُقِيْمَ بِهَا ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ فَلَمَّا دَخَلَهَا وَ مَضَى الْاَجَلُ خَرَجَ فَتَبِعَتْهُ اِبْنَةُ حَمْزَةَ

تُنَادِیْ یَاعَمِّ یَاعَمِّ. فَتَنَاوَلَهَا عَلِیٌّ فَأَخَذَ بِیَدِهَا فَاخْتَصَمَ فِیْهَا عَلِیٌّ وَ زَیْدٌ وَ جَعْفَرٌ. فَقَالَ عَلِیٌّ أَنَا أَخَذْتُهَا وَ هِیَ بِنْتُ عَمِّیْ. وَ قَالَ جَعْفَرٌ بِنْتُ عَمِّیْ وَ خَالَتُهَا تَحْتِیْ وَ قَالَ زَیْدٌ بِنْتُ أَخِیْ. فَقَضٰی بِهَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِخَالَتِهَا وَقَالَ الْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ وَقَالَ لِعَلِیٍّ أَنْتَ مِنِّیْ وَ أَنَا مِنْكَ، وَ قَالَ لِجَعْفَرٍ أَشْبَهْتَ خَلْقِیْ وَ خُلُقِیْ وَ قَالَ لِزَیْدٍ أَنْتَ أَخُوْنَا وَ مَوْلَانَا.

حضرت براء بن عازب سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے دن تین شرائط پر صلح کی تھی، ایک یہ کہ مشرکوں میں سے جو آپ کے پاس آئے گا وہ اسے مشرکین کو واپس کر دیں گے اور مشرکوں کے پاس جو مسلمان آئیں گے وہ انہیں آپ کے پاس واپس نہیں بھیجیں گے دوسری شرط یہ تھی کہ آپ مکہ میں آئندہ سال داخل ہوں گے اور وہاں تین دن قیام کریں گے۔ جب آپ مکہ میں داخل ہوئے اور مقررہ مدت گزر چکی تو آپ نکل گئے۔ اور آپ کے پیچھے پیچھے بنت حمزہ چچا! چچا! پکارتے ہوئے آگئی۔ حضرت علیؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر انھیں اپنے پاس رکھنے کے بارے میں حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ، اور حضرت زیدؓ میں جھگڑا ہو گیا، حضرت علیؓ نے کہا، میں نے انھیں پکڑا تھا، پھر یہ میری چچازاد بہن بھی ہیں۔ حضرت جعفرؓ نے کہا یہ میری چچازاد بہن بھی ہے ساتھ ہی ان کی خالہ میرے گھر میں ہیں۔ حضرت زیدؓ نے کہا "یہ تو میری بھتیجی ہیں"۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فیصلہ یہ کیا کہ وہ اپنی خالہ کے پاس رہیں گی اور فرمایا کہ خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے۔ پھر حضرت علیؓ سے فرمایا تم مجھ سے ہو اور میں تم سے۔ حضرت جعفرؓ نے فرمایا تم صورت و سیرت میں مجھ سے مشابہ ہو اور حضرت زیدؓ سے فرمایا تم ہمارے بھائی اور ہمارے آزاد کردہ غلام ہو۔

۳۹۔ متعدد حدیثوں کی رو سے بچوں پر والدین کی اور خاص کر ماں کی خدمت کا فریضہ عاید کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ بہ نسبت باپ کے ماں کو بچوں کی ولایت کے لئے زیادہ موزوں تصور فرماتے تھے۔

ہر مقدمہ کا فیصلہ حالات کے مطابق ہوتا تھا

یہ تمام حدیثیں (جو اوپر درج کی گئی ہیں) صرف یہ بتلاتی ہیں کہ رسول اکرمؐ ہر مقدمہ کے حالات کے اقتضا کے لحاظ سے مسائل کا تصفیہ فرمایا کرتے تھے، اس لئے ان کے فیصلوں کو عام اطلاق کے لئے نہیں لے لینا چاہیئے۔ آخر میں اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ کیا رسول اللہؐ نے خود حضرت ام سلمہؓ سے عقد نہیں کیا جن کے بچے پہلے شوہر سے موجود تھے اور جو رسول اللہؐ کے محرموں میں سے نہ تھے۔ کیا رسول اللہ سے عقد ثانی کر لینے کی وجہ سے ان بچوں کو ام سلمہؓ سے چھین لیا گیا؟ تاریخ بتلاتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ پس کیا وجہ ہے کہ دوسری ماؤں سے بچے اس بناء پر لے لئے جایا کریں۔

۴۰۔ جہاں تک نابالغوں کی جائیداد کا تعلق ہے کوئی حدیث میری نظر سے نہیں گذری جس میں کوئی واضح اور معین قاعدہ بتلایا گیا ہو۔ اس مسئلہ پر کافی غور و فکر کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلام میں کوئی ایسا قانون نہیں جس کے تابع نابالغ کی ذات و جائیداد کی ولایت کا تصفیہ ہو سکتا ہو۔ سب سے اہم امر جو ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے وہ نابالغ کا مفاد ہے۔ محض اس وجہ سے کہ ماں نے کسی ایسے شخص سے عقد ثانی کر لیا ہے جو رشتہ میں نابالغ کا محرم نہیں۔ بچہ کو ماں سے الگ نہیں کر لینا چاہیئے اگر اس کا ماں کے پاس رہنا اس کے حق میں بہتر ہو۔ مجھے اس کے لئے بھی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی کہ ماں یا ماں کی ماں یا جس کسی کے پاس بچہ ہو، ایک خاص عمر کو پہونچنے کے بعد بچہ اس کی تحویل سے چھین جائے اور اسے ایسے شخص کی تحویل میں نہ رہنے دیا جائے جس کے پاس رہنے سے اس کی بہتری ہو۔ ماں اور نانی ہی وہ اشخاص ہیں جو نابالغ کو ہر حملہ سے محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ ان میں اپنے نابالغ بچوں اور نواسوں کی وہ محبت و شفقت ہوتی ہے۔ ایسی محبت و شفقت کا کسی اور کو دعویٰ نہیں ہو سکتا۔

نابالغوں کی جائیداد کی ولایت

فیصلہ بر بنائے اقتضائے حالات

۴۱۔ اس مقدمہ میں نزاع ہے فی مابین ایک ماں کے (جس نے ایسے شخص سے عقد ثانی کر لیا ہے جو رشتہ میں نابالغ لڑکیوں کا محرم نہیں ہے) اور چچا کے۔ میں نے نابالغان کی ماں کے اس شوہر ثانی کو دیکھا ہے وہ ایک مستحسن شخص ہے اور معزز معلوم ہوتا ہے۔ مجھے بچوں کو ماں سے چھین کر درخواست گذار کے حوالہ کر دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں دکھائی دیتی۔ اس شخص کے لڑکے اور دوسرے رشتہ دار یقیناً ان نابالغوں کے محرم نہیں ہیں۔ لڑکیوں کی صورت میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو شخص ان کی تحویل چاہتا ہے اس کے اپنے لڑکے تو نہیں جو ان لڑکیوں کے لئے خطرناک ثابت ہوں۔ (جب کسی نابالغ لڑکی کا باپ دوسری عورت سے شادی کر لیتا ہے تو اس دوسری بیوی کے رشتہ دار جو یقیناً اس کے ہاں آتے جاتے ہوں گے ہو سکتا ہے کہ قطعاً ناپسندیدہ ہوں۔ اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ باپ یا دوسرے ذکور رشتہ داروں کے مقابلہ میں، ماں یا نانی، نابالغ لڑکی کی، دوسرے مردوں سے بہترین حفاظت کر سکتی ہے۔ خواہ پیر و خود اس ماں یا نانی کے اپنے شوہر بھی کیوں نہ ہوں۔

لہٰذا

میں اس اپیل کو منظور کرتا ہوں۔ اور حاکم عدالت گوجرانوالہ کے فیصلہ کو منسوخ کرتے ہوئے شہاب دین کی درخواست نامنظور کرتا ہوں۔ (یہ حکم ۲۴ جولائی ۱۹۶۰ء کو چیف جسٹس ایم۔ آر کیانی نے اپیلانٹ (مرافع) کے کونسل کو سنایا)

——— اپیل منظور کی گئی۔

لغات القرآن

تیسری جلد شائع ہو گئی چوتھی اور آخری جلد زیرِ طبع ہے

جن حضرات نے اس عظیم کتاب کی پہلی جلدیں دیکھی ہیں وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ یہ صرف قرآنی الفاظ کی لغات (ڈکشنری) نہیں بلکہ قرآن کریم کی مکمل تفسیر ہے۔ اس سے قرآن کا ہر لفظ۔ اس کی ہر آیت اور اس طرح پورے کا پورا قرآن، بغیر کسی اور مدد کے، خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ اور قرآنی تعلیم کے بنیادی تصورات جن پر دین کی ساری عمارت استوار ہے نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔

اس لغات کی مثال ہمارے سارے اسلامی لٹریچر میں کہیں نہیں ملے گی

اس کے بعد آپ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ ہم

قرآن کریم کس طرح سمجھیں

تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ (قیمت فی جلد پندرہ روپے) چوتھی اور آخری جلد زیر طبع ہے

ملنے کا پتہ

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷- بی ۔ شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور

رابطۂ باہمی

طلوع اسلام کنونشن

جیسا کہ سابقہ اشاعت میں اعلان کیا جا چکا ہے، امسال طلوع اسلام کنونشن ۷-۸-۹ اپریل (جمعہ ہفتہ۔ اتوار) کو حسب سابق، کنونشن ہاؤس۔ شاد مان ٹاؤن۔ لاہور میں منعقد کی جائے گی۔ جو احباب جمعرات کی شام کو پہنچنا چاہیں وہ اس امر کی اطلاع یکم اپریل تک دیدیں۔

(۲) رہائش اور خوراک کا انتظام صرف نمائندگان کے لئے ہوگا۔ مبصرین کے لئے نہیں ہوگا۔ مبصرین صرف کھلے اجلاس میں شریک ہو سکیں گے۔

(۳) جس مقام پر بزم طلوع اسلام نہ ہو، اگر وہاں سے کوئی صاحب کنونشن میں شریک ہونا چاہیں، تو وہ اپنے ارادے سے، ادارۂ طلوع اسلام۔ ۲۵-بی۔ گل برگ۔ لاہور، کو مطلع فرمائیں۔ وہ ادارہ کی طرف سے بطور مہمانان خصوصی مدعو کئے جا سکیں گے۔ ان کی رہائش اور خوراک کا انتظام کنونشن کی طرف سے ہوگا لیکن وہ صرف کھلے اجلاس میں شریک ہو سکیں گے۔

(۴) سال گذشتہ کے تجربہ اور عالمگیر گرانی نے مجبور کر دیا ہے کہ رہائش اور خوراک کے اخراجات کے سلسلہ میں کنونشن میں شریک ہونے والے نمائندگان (اور مہمانان) سے، مبلغ پندرہ روپے (فی کس) لئے جائیں۔ (اس میں چائے اور دیگر مشروبات شامل نہیں)۔ یہ رقم ۱۵ / مارچ تک صدر کنونشن کمیٹی کے نام پہنچ جانی چاہیئے۔

(۵) ہر بزم کو چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نمائندگان کنونشن میں شرکت کے لئے بھیجے۔

(۶) ہر بزم کم از کم ایک، (اور زیادہ سے زیادہ جتنے ہو سکیں) نمائندہ بطور رضا کار بھیجے۔ ان رضا کاروں کے نام ۲۰ / مارچ تک صدر کنونشن کمیٹی کے پاس پہنچ جانے چاہئیں۔ رضا کاران کے لئے ۵ / اپریل بدھ کی

شام تک پہنچ جانا ضروری ہوگا۔ اسے خاص طور پر ذہن میں رکھئے۔

(۷) بعض مقامات پر بزم خواتین بھی قائم ہو چکی ہیں۔ یہ بزمیں ۵ ارمارچ تک اطلاع دیں کہ ان کی طرف سے کون کونسی خواتین کنونشن میں شرکت کریں گی تاکہ ان کی رہائش کا خاص انتظام کیا جائے۔

(۸) کنونشن کا پروگرام اپریل کے طلوع اسلام میں شائع ہوگا۔

(۹) جو حضرات کنونشن میں تقریر کرنا چاہیں وہ اپنی تقریر کا مسودہ۔ اور جو بزمیں کوئی قرارداد پیش کرنا چاہیں، وہ اس قرارداد کا مسودہ، ۲۰ رمارچ تک صدر کنونشن کمیٹی کے پاس بالضرور بھیجدیں۔ والسلام

آپ کی آمد کا منتظر

(چوہدری) عبدالرحمٰن

صدر طلوع اسلام کنونشن کمیٹی ۲۷/بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

رپورٹیں

لندن

بزم کا اجلاس ۱۲ رفروری کو (16 - CHALCOT SQUARE) میں ہوا اراکین بزم کے علاوہ دیگر ہم خیال حضرات وخواتین نے شرکت کی۔ اجلاس میں ٹیپ ریکارڈ سے پرویز صاحب کی تقریر سنائی گئی۔ برکنیت کے نئے فارم پر کئے گئے اور اراکین کی مکمل فہرست مع پتہ جات مرتب کی گئی۔ ہر رکن نے عہد کیا ہے کہ وہ طلوع اسلام کے پیغام اور لٹریچر کو اپنے حلقے میں پھیلائے گا۔ چند نئے احباب نے مطبوعات طلوع اسلام بھی خریدیں وہ قرآنی فکر کی اس روشنی سے جو طلوع اسلام کے ذریعے پھیل رہی ہے کافی متاثر تھے۔

اجلاس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ یہاں مختلف مسلم ممالک کی جو انجمنیں قائم ہیں طلوع اسلام کے مقاصد سے تعارف کے لئے انھیں ضروری لٹریچر مہیا کیا جائے۔

سرگودھا

۲۲ ر جنوری مقامی بزم کی زندگی میں ارتقائی جدوجہد کا ایک یادگار دن تھا۔ اس روز سب سے پہلے ۱۰ بجے صبح) محترم عطاء اللہ خاں صاحب کے دولتکدہ پر ایک اجلاس عام کا انتظام کیا گیا۔ اس اجلاس میں، جو چوہدری نصر اللہ خاں صاحب کی صدارت میں ہوا، مقامی اراکین بزم کے علاوہ ایک سو کے قریب مقامی معززین اور میانوالی، سلانوالی، خوشاب، شاہ پور صدر، پنڈدادنخان اور چک نمبر ۸ شمالی کے احباب نے شرکت کی۔ خواتین کے لئے پردے کا

الگ انتظام تھا۔ حکیم منیر احمد عثمان صاحب ۔ محترم مجید الرحمن خاں ۔ فیاض علی خاں صاحب (نمائندہ بزم) اور سعید صاحب نے قرآنی تصورات کی روشنی میں اہم موضوعات پر حاضرین سے خطاب کیا۔ صدر اجلاس نے پرویز صاحب اور ان کے تازہ ترین شاہکار۔ لغات القرآن۔۔ سے حاضرین کا تعارف کرایا۔ حاضرین مفکر قرآن کے انقلاب آفریں قرآنی فکر سے بےحد متاثر تھے۔ خاتمہ اجلاس پر سب کی تواضع چائے سے کی گئی۔ صدر محترم نے اس موقع پہ بزم خواتین کے لئے "طاہرہ کے نام خطوط" کی بارہ جلدوں کی پیش کش کی۔

۲۔ اجلاس عام کے بعد، دو بجے بعد دوپہر احباب ضلع کا سالانہ خصوصی اجلاس ہوا۔ اور بزم کی تجدید کی کارروائی عمل میں آئی۔ محترم فیاض علی خان از سر نو سال آئندہ کے لئے بزم کے نمائندہ منتخب ہوئے اور چوہدری نصراللہ خاں ترجمان ضلع۔ چوہدری صاحب نے احباب سے خطاب کرتے ہوئے نمائندۂ بزم فیاض علی خاں، مجید الرحمان خاں، عثمان صاحب، محترم مولانا بخش صاحب اور دیگر احباب کی مساعی جمیلہ کو خراج تحسین پیش کیا جن کے خوشگوار نتائج سے سرگودھا میں قرآنی فکر کی روشنی شب و روز وسعت پذیر ہے۔ محترم فیاض علی خاں صاحب کی طرف سے اس موقع پر ظہرانہ کا بھی اہتمام کیا گیا۔

(۳) چار بجے بعد دوپہر مقامی بزم کا ایک تعزیتی اجلاس ہوا جس میں ترجمان ضلع چوہدری نصراللہ خاں صاحب کی والدہ مرحومہ کی رحلت پر ایک قرارداد کے ذریعے چوہدری صاحب موصوف سے اظہار تعزیت اور مرحومہ کے لئے بارگاہ رب العزت میں دعائے مغفرت کی گئی۔

بزم خواتین کا قیام

اجلاس عام سے فراغت کے بعد محترمہ مسعودہ رحیم صاحبہ کی صدارت میں خواتین کا اپنا الگ افتتاحی اجلاس بزم کے قیام کے سلسلے میں ہوا جس میں ساٹھ کے قریب خواتین نے شرکت کی۔ محترمہ مسرت صاحبہ نے جن کا قلب و نگاہ قرآنی فکر کی روشنی سے مالا مال ہے، "طاہرہ کے نام خطوط" سے بعض اہم نکات پڑھ کر سنائے اور خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد نے بزم کی رکنیت قبول کرتے ہوئے بہ خلوص قلب یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں اس روشنی کو آگے بڑھائیں گی۔ بزم خواتین کے آئندہ اجلاس کا انعقاد سٹلائٹ ٹاؤن میں تجویز ہوا ہے جس میں خواتین کی زیادہ سے زیادہ تعداد کی شرکت کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ محترمہ مسعودہ رحیم صاحبہ بزم خواتین کی نمائندہ منتخب ہوئی ہیں۔

لاہور

بزم کا ماہانہ اجلاس ۱۸ فروری کو دفتر بزم (۲۰۰ - بی، شاہ عالم مارکیٹ) میں منعقد ہوا - اجلاس میں طلوع اسلام کے نئے خریدار بنانے کی مہم کا جائزہ لیا گیا - اور احباب سے تاکید کی گئی کہ اس سلسلہ میں اپنی سرگرمیوں کو تیز تر کردیں - احباب کو "میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ" کے قیام سے مطلع کیا گیا - اور واضح کیا گیا کہ ہر قسم کی مطبوعات کی ضرورت اور طباعت وغیرہ کے لئے کمپنی مذکور اور اس کے مطبع کی طرف رجوع کریں - آیندہ سالانہ کنونشن کے سلسلے میں رضاکاروں کے طور پر اپنی خدمات کی پیش کش کے لئے بھی احباب سے اپیل کی گئی۔

مری

شدت سرما کی موسمی کیفیت کے باعث بزم کا صرف ایک اجلاس ہو سکا - بہت سے احباب مری سے باہر ہیں - برفباری اور تند و تیز ہوا میں احباب کے اجتماعات ناممکن ہو کر رہ گئے ہیں اس لئے سب سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی کوششیں انفرادی طور پر جاری رکھیں۔

سید حسین (ضلع جہلم)

اوائل فروری میں بزم کا اجلاس ڈاکٹر محمد اکرم صاحب کی صدارت میں ہوا - فیصلہ کیا گیا کہ ہر اجلاس سے قبل اراکین بزم اپنی اپنی کارکردگی کی رپورٹ سکریٹری بزم کو پیش کریں تاکہ اسے اجلاس میں سب کے سامنے لایا جا سکے - لائبریری اور اس کی کتب کی تقسیم کا کام باضابطہ طور پر منظم کیا جائے۔

سید یوسف شاہ صاحب نے نظام ربوبیت کے خط و خال کو دل نشین انداز میں پیش کیا - سید محمد حسین شاہ صاحب نے اصولی ہدایات برائے نظم و ضبط پڑھ کر سنائیں جس سے دو نئے احباب شریک بزم ہوئے۔

ڈاکٹر اکرم صاحب (صدر اجلاس) نے "بادۂ زندگی" کو زبانی طور پر پیش کیا۔

بوریوالہ (ضلع ملتان)

بزم کے قیام کے بعد اب احباب قرآنی فکر کو آگے بڑھانے میں منظم طور پر کوشاں ہیں - طلوع اسلام کا لٹریچر اہل علم طبقہ کو مہیا کیا جا رہا ہے - اہتمام تفہیم کی دو ہفتہ وار مجلسیں بھی ہوتی ہیں - ابھی ابھی اراکین بزم نے دو نواحی بستیوں کا دورہ کیا اور اس سے یہ امید ہو گئی ہے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں یہ سفر خوش آیند نتائج پیدا کریں گے - لائبریری کا قیام بھی عمل میں آگیا ہے اور اس کی کتابوں سے استفادہ حاصل کرنے کے مواقع فراہم کئے جا رہے ہیں - سراج منیر صاحب نے دفتری امور کو سنبھال لیا ہے اور وہ انھیں خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

کوئٹہ

یہاں مقامی بزم کا از سر نو احیاء ہوا ہے - میر احسان صاحب کو نمایندہ بزم منتخب کیا گیا اور غلام کبریا خان صاحب نے (بحیثیت سکریٹری) دفتری امور سنبھال لئے ہیں - فارم رکنیت از سر نو پر کئے جا رہے ہیں۔

نئی بزموں کی توثیق

ادارہ بزم خواتین طلوع اسلام سرگودھا کے قیام اور بزم کوئٹہ کے از سر نو احیاء کی توثیق کرتا ہے۔

قائدِ اعظم

(۶)

(تحریکِ استقلال پاکستان کی پہلی منزل پر) بڑھا اور آگے ہی بڑھتا گیا

(محترم صفدر سلیمی صاحب)

عنوان بالا کے تحت یہ تفصیلی سلسلہ گذشتہ جنوری کی اشاعت میں مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس لاہور اور اس اجلاس میں طے شدہ "قراردادِ پاکستان" تک پہنچا تھا۔ زیرِ نظر قسط اب اس تفصیل کو لئے آگے بڑھتی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

قراردادِ پاکستان کے منظرِ عام پر آنے کے بعد، چھ ماہ کی مختصر سی مدت میں، ملتِ اسلامیہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ صدیوں کے بعد ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ دس کروڑ مسلمان ایک قائد کے اشارے پر ایک نشانِ منزل اور ایک نصب العین کو لئے ہوئے آزادی اور استقلال کی راہوں میں سرگرمِ تگ و تاز تھے۔

مدتوں کے بعد پہلی دفعہ انہوں نے اپنی جداگانہ قومی حیثیت کی وجہ جواز دنیا کے سامنے پیش کی تھی اور اسی اساس پر اپنے لئے ایک جداگانہ مملکت کے حصول کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیا تھا۔ اب یہ ناممکن تھا کہ برطانوی حکومت انتقالِ اختیارات کے دوران میں اس حقیقتِ ثابتہ سے گریز کی راہیں اختیار کر سکے۔ کانگرس یا کسی دوسری طاقت سے مرعوب ہو کر ملتِ اسلامیہ کے حقِ خود ارادیت سے انکار، اب اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ ایسا اقدام اس قوم کی غیرت کے لئے ایک مستقل چیلنج ہوتا جو صدیوں تک یہاں حکومت کر چکی تھی اور اب پھر ایک مضبوط قوم کی حیثیت سے اپنی آزادی کا مقام متعین کر چکی تھی۔

سیاسیاتِ ہند کی اس نئی کیفیت نے کانگرس کے سارے منصوبوں کو خطرے میں ڈال دیا اور بالآخر اس نے انفرادی ستیہ گرہ کا نیا حربہ بروئے کار لانے کی سعی کی۔ ستیہ گرہ کی یہ علامتی تحریک اس خوش فہمی میں شروع کی گئی کہ جنگ کے دوران

میں اس داخلی انتشار سے مرعوب ہو کر برطانوی حکومت کانگرس کے مطالبات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے گی۔ لیکن ملت اسلامیہ اپنے عظیم قائد کی قیادت میں اب اس مقام پر کھڑی تھی جسے نظر انداز کرنا کانگریس کے بس کا روگ نہیں تھا۔

نومبر سنہ ۱۹۴۰ء میں اس مہم کا آغاز کرتے ہوئے مشہور کانگرسی رہنما مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے گاندھی جی سے مشورہ کے بعد مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ان کے راستے میں رکاوٹ نہ پیدا کریں۔ تحریک کا آغاز ہوتے ہی قائداعظم کو عربک کالج دہلی میں خطاب کا موقع ملا اور انہوں نے اس تحریک اور ڈیسائی کی اپیل کا تجزیہ کرتے ہوئے حقائق کے چہرے سے نقاب الٹ دیا۔ انہوں نے فرمایا۔

کانگرس کو اپنے طریق کار کے مطابق جنگ لڑنے دیجئے لیکن کیا میں کانگرس ہائی کمان سے — جس کے ایک رکن مسٹر ڈیسائی بھی ہیں — وہ اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے قائد بھی ہیں — یہ پوچھ سکتا ہوں کہ برطانوی حکومت کے خلاف آخر کانگرس کے جنگی مقاصد کیا ہیں؟ ہمیں تو کانگرس کے جنگی مقاصد یہی نظر آتے ہیں کہ ہر ممکن طریق سے حکومت پہ دباؤ ڈال کر اسے مجبور کیا جائے کہ وہ ہماری اہمیت کو نظر انداز کر کے ہمیں بھیڑیوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ دے۔ یہ ہے کانگرس کا مقصد۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر خود فریبی کی یہ پالیسی کیوں؟ ہم حتی الامکان مبتلائے فریب نہیں ہوں گے (Speeches and writings of Mr. Jinnah, Vol. I, P. 204)

مرکزی اسمبلی کی اہم تقریر

۱۹ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء کو میزانیہ پہ بحث کے دوران میں قائداعظم کی اہم تقریر مرکزی اسمبلی کے ایوان میں غلغلہ انداز ہوئی۔ اس تقریر کا شمار قائداعظم کی اہم ترین پارلیمانی تقاریر میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اس طویل اور پُر زور خطاب میں پورے دلائل و براہین سے مسلح ہو کر سرکاری اور کانگرسی بنچوں کو چیلنج کیا اور بالخصوص راج گوپال اچاریہ کی "پُر خطر پیش کش" پہ تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:-

مسٹر راج گوپال اچاریہ نے ایک پُر خطر پیش کش کی ہے ہمارے لائق و فائق نمائندگان صحافت بھی جن کی ایک فوج کی فوج میں یہاں دیکھ رہا ہوں ہم سے مسلسل پوچھ رہے ہیں کہ مسٹر اچاریہ کی پیش کش پر کیوں توجہ نہیں دی جا رہی۔ لیکن وہ پیش کش ہے کہاں؟ (اس پیش کش کا اقتباس پیش کرتے ہوئے قائداعظم نے مسٹر اچاریہ کے یہ الفاظ دہرائے)

"اقلیتوں کی مشکلات کے سلسلے میں میں مسٹر ایمری کو جوابا یہ پیش کش کروں گا کہ اگر ملک معظم کی حکومت ایک ہنگامی نیشنل گورنمنٹ کی تشکیل پہ آمادہ ہو تو میں کانگرسی

رفقاء کار کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کروں گا کہ مسلم لیگ ایک وزیر اعظم نامزد کرے
اور اسے ایک مناسب قومی حکومت متشکل کرنے کا موقع دے۔"

تو پھر جناب والا! اپنے ہونے والے صدر اعظم (قائداعظم) کو گفت و شنید کی دعوت دینے کے بجائے وہ (مسٹر اچاریہ) ڈیلی ہیرلڈ کو گھسیٹ مارتے ہیں کہ میں مجلس عاملہ کے رفقاء کار کو یوں مناؤں گا اور یوں راضی کر لوں گا ــــ میں اپنے معزز دوستوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا اس طریق کار کو درست قرار دیا جا سکتا ہے۔ (ایضاً)

پھر انہوں نے مسٹر اچاریہ کی پیش کش کے یہ الفاظ دہرائے:-

"مسٹر جناح کو ابتداء میں یہ پیش کش کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ بجا طور پر اسے اپنی ہتک خیال کرتے ہوئے یہ دندان شکن جواب دے سکتے تھے کہ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوں" (ایضاً)

اور پھر اس حصہ کا جواب دیتے ہوئے قائداعظم نے کہا۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر مسٹر ایمری اسے قبول کر لیتے اور اس کے بعد لازمی طور پر مجھے یہ پیش کش کی جاتی تو کیا اُس وقت بھی اس کا وہی دندان شکن جواب نہیں ہو سکتا تھا؟ مسٹر اچاریہ کے خیال کے مطابق میرا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ "مسٹر ایمری اور مسٹر راج گوپال اچاریہ دونوں میری ہتک کر رہے ہیں۔ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا ہوں" کم از کم دوسروں کے فہم و ادراک سے تو حسن ظن رکھو۔ (ایضاً)

بظاہر کتنی بڑی دل فریب پیش کش تھی جو قائداعظم کو کانگرس کی طرف سے کی گئی یعنی انہیں نیشنل گورنمنٹ میں کابینہ کی تشکیل اور وزیر اعظم کے تقرر کا حق دیا جا رہا ہے۔ یہ پیش کش بہت بڑا امتحان تھا ــــ ایک کڑی آزمائش تھی ایک عظیم قائد کے تدبر اور فراست کی۔ کوئی دوسرا لیڈر ہوتا تو یقیناً کسی خوش فہمی کا شکار ہو کر اسے فوراً قبول کر لیتا اور خوشی سے جامے میں پھولا نہ سماتا لیکن قائداعظم کی عقابی نگاہیں مکر و فریب کے زریں نقابوں میں مضمر فتنوں کو بھانپنے کی پوری صلاحیتوں سے مالا مال تھیں وہ فوراً سمجھ گئے کہ تشکیل حکومت کی یہ پیش کش حصول پاکستان کے سارے امکانات کو سبوتاژ کر کے رکھ دے گی۔ چنانچہ مرکزی اسمبلی میں اسی پیش کش کی تفصیل پیش کرنے کے بعد انہوں نے اپنے مخصوص نپے تلے انداز میں فرمایا:-

جمہوریت، جمہوریت، جمہوریت! اور ایک قومی حکومت!! اس سے کیا حاصل؟ کابینہ خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو وہ اسی مجلس دستور ساز کو جواب دہ ہوگی جس کے دو تہائی منتخب ارکان پر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی اپنا اقتدار رکھتے ہیں۔

ہیں اس شخص کو قابل رحم سمجھوں گا جو ایسی کابینہ میں ہو اور کانگرسی انتداب اور اس کے حکم کی تعمیل نہ کرے۔ (ایضاً)

اور پھر اسی تقریر کے اخیر میں حکومت اور کانگرس کے نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا

ہم نے آخری اور حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ پاکستان ہمارا واحد نصب العین ہے ہم اس کی خاطر مسلسل جدوجہد کریں گے اور اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔ کسی کو بھی اس بارے میں غلط فہمی نہ رہنی چاہئے۔ جمہوری نظام حکومت کا جنازہ نکل چکا ہے اس قسم کی جمہوریت کا جو مسٹر ڈیسائی کے پیش نظر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری تعداد کم ہو لیکن حکومت کو معلوم ہے ——— اور میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں ——— کہ اپنی کمی تعداد کے باوجود اگر ہم اس امر کا ارادہ کر لیں تو تمہارے لئے اس سے سو گنا زیادہ مشکلات پیدا کر سکتے ہیں جو کانگرس نے آج تک کی ہیں۔ یہ ایک دھمکی نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اعلان ہے جس سے میں تمہیں خبردار کرتا ہوں۔ (ایضاً)

نوجوانانِ ملت سے خطاب

ایک سال کی مختصر سی مدت میں تحریک پاکستان کاروانِ ملت کے لئے ایک نشانِ منزل کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک افرادِ ملت کے دلوں میں ذوقِ سفر کی امنگیں اور ولولے انگڑائیاں لے رہے تھے۔ ملت کے ہزاروں نوجوان جو ایک سال قبل تک کانگرس کو آزادی کی علمبردار سمجھ کر اس کی پُرفریب اداؤں اور عشوہ طرازیوں سے لو لگائے بیٹھے تھے نقاب اٹھ جانے کے بعد اب اُسے دشمن دین و آگہی پا رہے تھے۔ قائداعظم کی دعوتِ فکر و عمل میں انہوں نے اپنی ملتِ عزیز کی نشاۃ ثانیہ کے سہانے خواب محسوس و مشہود حقائق میں ابھرتے دیکھ لئے تھے اور قوم شناسیوں کا یہ احساس ان کے دلوں میں کروٹیں لے رہا تھا کہ اس کٹھن مرحلے پر انہیں اپنے بوڑھے قائد کے دست و بازو بننے کے لئے آگے بڑھنا چاہئے۔ چنانچہ تحریک پاکستان کو جنم لئے ابھی سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ پنجاب کے طلباء نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے اپنے آپ کو ایک مضبوط سانچ تنظیم میں یکجا اور ہم آہنگ کر لیا اور یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو اپنی پاکستان کانفرنس لاہور میں وہ ہزاروں کی تعداد میں اس وفورِ عزم سے قائداعظم کو اپنے حلقے میں لئے ہوئے تھے کہ اس کانفرنس پر شمع اور پروانوں کی انجمن کا گمان ہو رہا تھا۔ قائداعظم کے خون میں ایک نئی تر و تازگی رقصاں تھی جب انہوں نے اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

تاریخ کی ترتیب میں یہ ایک حیران کن حقیقت قرار پائے گی کہ تین سال کی مدت میں تو کروڑ

مسلمانوں کی ایک جمعیت کیونکر ایک پلیٹ فارم کے گرد اکٹھا ہو اور ایک پرچم کے سائے میں مجتمع ہو گئی ...... ایک ایسی حقیقت جو آپ کو دو صدیوں سے دیکھنے میں نہیں آئی۔ زنا لیاں (یہ سب کچھ ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ چیز معرض وجود میں آگئی۔

حصول پاکستان کی کٹھن منزل کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے قائداعظم نے ان گرم جوش نوجوانوں پر واضح کیا
یاد رکھئے کہ یہ کوئی معمولی سا معاملہ نہیں۔ یہ ایک عظیم ترین مرحلہ ہے جو سلطنت مغلیہ کے زوال سے اب تک پہلی بار تمہاری زندگی میں سامنے آیا ہے۔ آپ کو جان لینا چاہئے کہ اس کے لئے تمام ضروری وسائل اور تیاریوں کی ضرورت ہے تاکہ اس نصب العین کو حاصل کیا جا سکے۔ آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں گے کہ نہ تو جذبات کی رو میں بہہ جائیے اور نہ نعروں میں کھو جائیے۔ ایک قوم کی تعمیر کیسے ہوتی ہے اور ایک زوال پذیر قوم کی بازآفرینی کی صورت کیا ہے؟ یہ ہیں اصل سوالات۔

آج ہم زوال یافتہ قوموں میں شمار ہوتے ہیں، ہمیں بدترین دن دیکھنے پڑے ہیں۔ تاہم میں آج مسرور ہوں کہ اس ملک میں ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ اور بازآفرینی کا روشن امکان نظر آ رہا ہے۔ ہم ابھی بمشکل بیدار ہوئے ہیں اور آنکھیں مل رہے ہیں۔ ہم میں ابھی یہ شعور ابھرا ہے کہ اپنے گرد و پیش نگاہ ڈالیں۔ ہماری کیفیت ابھی ایک مریض کی سی ہے۔ ہم ابھی لاچار ہیں۔ اس لئے پیشتر اس کے کہ آپ پوری طرح صحت مند، مضبوط اور سفر کے قابل ہوں آپ کو صحت یابی کا مرحلہ طے کرنا ہوگا۔ آپ اپنے عوام کو کیونکر اس مقام اور تیاری تک لے جا سکیں گے جہاں آپ اپنے نصب العین کے حصول کے قابل ہو سکیں۔ یہ کوئی شاہی سڑک نہیں۔ اس لئے میرے نوجوان دوستو! سب سے پہلے قومی تعمیر کے متعلق شعبوں پر اپنے دل و دماغ بروئے کار لائیے۔ (خطبہ صدارت قائداعظم۔ ۲ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء)

اس خطاب کے ٹھیک آٹھ دن بعد قوم کا کہن سال رہنما علی گڑھ یونیورسٹی کے شاہین بچوں کو خطاب کر رہا تھا۔ ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین کے زیر اہتمام نوجوانان ملت کے اجتماع عظیم میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔ اور ان کی عقابی روح کو جھنجھوڑتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا:-

وزیر ہند مسٹر ایمری آج یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ نو کروڑ مسلمانوں کو ایک جداگانہ دستوری عنصر کی حیثیت حاصل ہے وہ کوئی عددی اقلیت کی طرح نہیں۔ اور ان کی منشا کے خلاف ان پر کوئی دستور ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آج وحدت ہند کا ستون ٹوٹ چکا ہے بلکہ پوری طرح مسمار ہو گیا ہے۔

(Speeches and writing of Mr. Jinnah, Vol. I, P.202)

اور اس کے بعد انہوں نے واضح کیا کہ

> پاکستان ایک قابلِ عمل نصب العین ہی نہیں بلکہ اس برصغیر میں اسلام کو مکمل تباہی سے بچانے کا واحد راستہ ہے۔ ابھی ہم نے ایک طویل منزل طے کرنی ہے۔ بلاشبہ پاکستان موجود ہے لیکن ہم نے اسے حاصل کرنا ہے۔ آزادی کا حصول اس کے تحفظ کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے۔ انگلستان اور امریکہ آج آزاد ہیں لیکن سوچئے کہ اپنی آزادی کے استحکام کے لئے انہیں کس قدر شدید جدوجہد کرنی پڑتی ہمیں اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کرنا ہے۔ اپنی صفوں کو مضبوط کیجئے۔ ہمارے سامنے نہ صرف داخلی تحفظ کے مسائل ہیں بلکہ خارجی جارحیت کا مقابلہ بھی۔ آزادی کا حصول اور اس کا بقاء و استحکام چرخہ کاتنے سے ممکن نہیں ہمیں اپنے مساکن اور مقدس مقاصد کی خاطر لڑائی اور دفاع کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اور یقین رکھئے کہ پاکستان تمہارے ہاتھوں میں ہوگا۔ (ایضاً صفحہ ۱۹۲)

اجلاس مدراس

لاہور کے تاریخی اجلاس (مارچ سنہ ۱۹۴۰ء) کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس اپریل سنہ ۱۹۴۱ء میں مدراس کے مقام پر ہوا۔ اس عظیم قومی اجتماع سے قبل مارچ کا پورا مہینہ قائداعظم نے پُرہجوم مصروفیات میں گذارا۔ لاہور، علی گڈھ اور کانپور کی کانفرنسیں اور شب و روز کی مسلسل تگ و تاز ان کی صحت پر اثر انداز ہوئی اور بمبئی کو واپس جاتے ہوئے وہ خرابیٔ صحت کا شکار ہوگئے۔ اجلاس مدراس میں ان کی شرکت فرمانی اشد ضروری تھی۔ چنانچہ وہ اسی حالت میں عازم مدراس ہوگئے۔ دوران سفر میں بے ہوشی کا غلبہ ہوا اور مدراس پہنچتے پہنچتے طبیعت اس قدر ناساز ہوگئی کہ بہت سے اندیشے اُبھر کر سامنے آگئے۔ اسلامیان مدراس شاندار استقبال کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ لاکھوں کا اجتماع ریلوے سٹیشن سے باہر اپنے محبوب قائد کی راہ میں آنکھیں بچھانے کے لئے بے تاب کھڑا تھا۔ لیکن جب سپیشل ٹرین سٹیشن پر پہنچی اور انہیں معلوم ہوا کہ ان کی قومی تقدیر کا پاسبان ناسازیٔ طبع کے باعث جلوس میں شرکت سے معذور ہے تو ہیجان و اضطراب کی لرزشوں نے ان کے دلوں میں تہلکہ سا مچا دیا۔ بڑا ہی اثر انگیز اور قابل دید یہ منظر تھا جب ہزاروں اور لاکھوں فرزندانِ توحید لرزتے ہوئے دلوں اور خلوص و محبت کے آنسوؤں سے اپنے محبوب زعیم کی صحت یابی کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔ قائداعظم جلوس میں شریک نہ ہوسکے لیکن یہ شاید ان خلوص بھری دعاؤں کا اثر تھا کہ ناسازیٔ طبع کے باوجود جب وہ صدارتی خطاب کے لئے مائیک کے سامنے آئے تو ان کی پُرعزم آواز میں گویا بجلیاں سی کوند رہی تھیں۔ اور مسلسل دو گھنٹوں تک ان کا وہ انقلاب آفریں خطاب جاری رہا جس میں ملکی سیاسیات کا عالمانہ تجزیہ تھا۔ منزل مقصود کی کٹھن گھاٹیوں کی نشان دہی تھی، ذوقِ سفر کے تقاضوں کی تفصیل تھی،

دلائل و براہین کی آب و تاب تھی۔ شہ نشانوں (LAND MARKS) کا تعین تھا۔ غیروں کو انتباہ تھا۔ اپنوں سے اپیل تھی۔ قائد اعظم کے اس خطبۂ صدارت کو بجا طور پر ایک حکیم سیاست کا شاہکار اور ایک سالار انقلاب کی محشر انگیز للکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس صدارتی خطاب کا آغاز کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:۔

یقین مانئے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد مسلمان اس قدر منظم، اس قدر زندہ اور ایسے بیدار کبھی نہ ہوئے تھے جیسے کہ آج ہیں۔ آج ہمارے سروں پر ہمارا اپنا پرچم لہرا رہا ہے یعنی ہندی مسلمانوں کا ملی پرچم۔ ہم نے ایسا پلیٹ فارم قائم کر لیا ہے جو مسلمانانِ ہند کی وحدت کا مظہر ہے۔ ہم نے نہایت واضح الفاظ میں متعین کر دیا ہے کہ ہمارا نصب العین پاکستان ہے۔

ارکین مسلم لیگ کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

آپ کے سامنے سب سے بڑا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس قسم کی تربیت دیں کہ وہ دنیائے سیاست میں الفاظ و جذبات اور اعمال کے اعتبار سے نہ صرف اس ملک میں بلکہ ساری دنیا میں ممتاز ہو جائیں اور اس قابل ہوں کہ وہ ہر وقت مشکلات سے نبرد آزمائی کے قابل ہو سکیں۔

مسلم لیگ کی آئیڈیالوجی کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

مسلم لیگ کی آئیڈیالوجی مسلم ہندوستان اور خود مختار قومیت کے بنیادی اصولوں پر استوار ہوتی ہے۔ اور ہر اس کوشش کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا جو ہماری قومیت، سیاسی تشخص یا ملی وجود کو ختم کرنے کے لئے بروئے کار لایا جائے گا۔ ایسی کوشش سعیٔ لاحاصل ثابت ہوگی۔ ہم یہ عزم صمیم لے کر اٹھے ہیں ـــــ اور اس بارے میں کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنا چاہئے ـــــ کہ اس برصغیر میں ایک آزاد قوم کا منصب حاصل کریں اور ایک خود مختار مملکت کا قیام عمل میں لائیں۔ (تقاریر و تحریرات جناح۔ جلد اول صفحہ ۲۸۰)

دراوڑ قوم کے افراد کا ذکر کرتے ہوئے جو ہزاروں کی تعداد میں شریک اجلاس تھے قائد اعظم نے ان کی غریب خوردگی اور زبوں حالی پر مخلصانہ ہمدردی کا اظہار کیا اور فرمایا۔

یہ سرزمین حقیقی معنوں میں دراوڑستان ہے۔ غور فرمایئے کہ تین فی صدی اعلیٰ ذات کے برہمن کس طرح اپنی شاطرانہ چالوں اور پُرفریب ہتھکنڈوں سے یہاں اکثریت بن بیٹھے ہیں۔ کیا جمہوریت اسی کا نام ہے یا یہ ایک فریب محض ہے۔ یہی وہ صورت ہے جس کی بنا پر میں یہاں کے غیر برہمنوں کے لئے انتہائی ہمدردی اور ہر ممکن امداد کا اعلان کرتا ہوں۔ ان کے نام میرا پیغام یہ ہے کہ اٹھیے اور خود شناسی سے کام لیجئے۔ اپنی ثقافت اور اپنی روایات کے مطابق زندگی بسر کیجئے۔ خدا کا شکر

ہے کہ ہندی زبان نے یہاں اپنے قدم نہیں جمائے۔ تمہاری روایات کا تقاضا ہے کہ اپنے نظریات کی روشنی میں آگے بڑھیے۔ میں آپ کے مقاصد سے گہری وابستگی کا اظہار کرتا ہوں اور دراوڑستان کے قیام میں آپ کو حتی الامکان امداد مہیا کرنے کو تیار ہوں۔ یقین رکھئے کہ صوبہ مدراس کے سات فی صدی مسلمان آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے اور باہمی مساوات، انصاف اور خیر سگالی کے اصولوں پر آپ کی رفاقت کریں گے۔ (ایضاً صفحہ ۲۰۹)

کرپس مشن اور قائداعظم

مسلم لیگ کے اجلاس مدراس کے بعد سر سٹیفورڈ کرپس کی ہندوستان میں آمد سیاسیات ہند کا ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ ہندوستان کی سرحدوں کی طرف جاپان کے بڑھتے ہوئے قدم یونین جیک کی عالمگیر اڑانوں کے لئے ایک واضح خطرہ بن کر سامنے آ رہے تھے۔ اور برطانوی سامراج کے نمائندوں کی سیاسی مصلحتوں نے پوری شدت سے اپنی مفاد پرستیوں کے اس تقاضے کو محسوس کیا کہ ہندوستان کی قومی زندگی کے مختلف عناصر کو ایک عارضی حکومت کے نظام میں شریک کرنا اور اس طرح ان کا تعاون اور اشتراک عمل حاصل کر کے حملہ آور دشمنوں سے نبٹنا اشد ضروری ہے چنانچہ برطانوی حکومت کے اس مشن کی تکمیل کے لئے فرنگی سیاست کے مشہور مہرہ باز سر سٹیفورڈ کرپس مارچ ۱۹۴۲ء میں دلی پہنچے اور یہاں پہنچ کر عارضی حکومت کے قیام کی تجاویز یہاں کی سیاسی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے سامنے پیش کر دیں۔

سر سٹیفورڈ کرپس کا ورود ہند ہندو کانگرس کے لئے مسرت اور شادمانی کی نوید تھی۔ اس سے قبل کانگرسی لیڈروں سے ان کی کافی رسم و راہ تھی۔ وہ آنند بھون میں پنڈت نہرو کی مہمان نوازیوں سے بھی لطف اندوز ہو چکے تھے۔ چنانچہ سر کرپس کی آمد کی خبر سے وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ وہ گویا حکومت کی باگ ڈور چپکے سے کانگرس کو سونپ کر واپس ہو جائیں گے اور ہندو راج کے سہانے خوابوں کو عملی صورت اختیار کرنے کا موقع مل جائے گا۔ جہاں ایک طرف ہندو قوم خوشی کے شادیانے بجا رہی تھی وہاں یہ صورت حال ملت اسلامیہ کے لئے ہیجان و اضطراب کا سامان بن رہی تھی۔ ملت کے ایک ایک بہی خواہ کے سینے میں یہ اندیشہ جاگزیں ہو رہا تھا کہ اگر سر کرپس کانگرس کا حق نمک ادا کرنے پر اتر آئے تو کیا ہوگا۔

یہ تھی وہ صورت حال جب کہ سر کرپس نے ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۲ء کو دلی کی سرزمین پر قدم رکھا۔ یہی تاریخ حسن اتفاق سے "یوم پاکستان" کی تاریخ تھی۔ اس روز ملک کے طول و عرض میں دس کروڑ مسلمان قرارداد پاکستان کے تجدید عہد کے سلسلے میں پورے جوش و خروش سے سالانہ تقریب منا رہے تھے۔ کرپس دلی میں موجود تھے اور قائداعظم بھی۔ اسلامیانِ دلی کا عظیم الشان جلوس پورے جاہ و جلال سے دلی کے بازاروں سے

گذرا اور اردو پارک کے وسیع میدان میں ان کے محبوب قائداعظم نے انہیں مخاطب کیا۔ عزم و استقلال کا عظیم و جلیل پیکر ایک مرد مومن کا یقین محکم سینے میں لیے وابستگان ملت کو خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال کر رہا تھا۔ اس کی بھرپور آواز جامع شاہجہانی کے میناروں سے ٹکرا رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا :۔

میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ دیگر جماعتوں سے کہیں زیادہ مسلم لیگ ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری کی علم بردار ہے۔ ہم عدل و انصاف اور راست بازی کے طلب گار ہیں ہم دوسرے فرقوں سے کسی جلب منفعت کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ہم اس ملک میں ایک آزاد اور خود مختار قوم کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ہم اقلیت ہرگز نہیں بلکہ قوم ہیں۔

سرسٹیفورڈ کرپس کی سفارت کے بارے میں میں مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ تاوقتیکہ ہز مجسٹی کی حکومت کی تجاویز ان کے سامنے پیش کی جائیں وہ صبر و ضبط سے کام لیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ تجاویز مسلمانوں کے خلاف ہوں گی تو ہم نہ صرف انہیں مسترد کر دیں گے بلکہ اپنی پوری طاقت سے اس کے مزاحم ہوں گے اور اس کوشش میں اگر جان بھی دینی پڑے تو لڑتے ہوئے جان دے دیں گے۔ میں حکومت کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ مسلم لیگ کو دبانے یا اس کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے ...... مسلمانوں کو اس کا خوف ہے کہ سرسٹیفورڈ کرپس کانگرس کے دوست ہیں۔ وہ آنند بھون میں پنڈت جواہر لال نہرو کی مہمان نوازی کا لطف اٹھا چکے ہیں۔ یہ سب صحیح ہے لیکن ہمیں محض اس وجہ سے خوف زدہ نہ ہونا چاہیئے۔ آپ ذرا حوصلے سے کام لیں۔ سرسٹیفورڈ کرپس خانگی حیثیت سے نہیں بلکہ برطانوی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے ہندوستان آئے ہیں۔ اس لیے حکومت برطانیہ کی جو تجویز یا منصوبہ وہ اپنے ساتھ لائے ہیں جب تک ہمارے سامنے نہ آجائے ہمیں صبر سے کام لینا چاہیئے

(قائداعظم محمد علی جناح ــ ص ۵۵۱، ۵۵۲)

حکومت اور کانگرس کے حاشیہ بردار مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا :۔

یہ صحیح ہے کہ برطانیہ اور کانگرس کے چند "مسلمان دلالوں" کے ذریعے مسلم لیگ میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ یہ کانگرس کے پروردے ہیں اور برطانوی شہنشاہیت کے معاون و مددگار۔ کسی نہ کسی طرح ہندو اخبارات ان کا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں۔ میں ایسے مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتا جو دشمن کے لشکر میں جائیں اور وہاں سے ہم پر تیر چلائیں مسلمانوں اور مسلم لیگ میں تفرقہ اندازی کی کوشش بالکل بے سود بلکہ ایک بے ہودہ تماشہ ہے۔ کیونکہ آپ نے دنیا پر ثابت کر دیا ہے کہ صرف مسلم لیگ ہی مسلمانوں کا واحد نمائندہ ادارہ ہے۔ (ایضاً)

۳۰۔ مارچ ۱۹۴۲ء کو حکومت برطانیہ کی وہ تجاویز جو سر کرپس ساتھ لائے تھے شائع کر دی گئیں۔ یہ موقع نہیں کہ ہم ان تجاویز کے طویل سلسلہ کی تفاصیل پیش کر سکیں۔ ان تجاویز کا لب لباب یہ تھا کہ اختتام جنگ کے فوراً بعد ایک منتخب دستوریہ کے ذریعہ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری سونپ دی جائے گی لیکن جو صوبے دستور ساز اسمبلی کے مرتبہ دستور کو تسلیم کرنے پر رضامند نہیں ہوں گے۔ انہیں اپنے لئے ایک جداگانہ دستور کی تدوین اور اس کے مطابق خود مختارانہ حیثیت اختیار کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی موجود تھی کہ انتقال اختیارات کے سلسلہ میں ملک معظم کی حکومت اور ملک کے مجموعی طور پر منتخب دستوری ادارہ میں ایک معاہدہ طے پائے گا۔ اور اس معاہدہ کے ذریعے اسے مکمل اختیارات سونپ دیئے جائیں گے۔

ان تجاویز میں یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ موجودہ نازک دور اور نئے آئین کی تشکیل تک ایک عبوری حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ جس میں ملک کی اہم جماعتوں کے قائدین کو شریک ہونے کی دعوت دی جائیگی سر کرپس تجاویز کے منظر اشاعت پر آتے ہی کانگرس کی ساری خوش فہمیاں ماند پڑ گئیں۔ تجاویز میں صوبوں کے لئے یہ آزادی موجود تھی کہ وہ چاہیں تو اپنے لئے الگ دستور مرتب کر لیں۔ بالفاظ دیگر مطالبہ پاکستان کو مبہم انداز میں تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس بنا پر پورے ملک میں ہندو راج کا سہانا خواب خواب پریشاں ہوتا نظر آرہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف کانگرس نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ "یہ ایک زائد الیعاد چیک ہے"۔ اور دوسری طرف مسلم لیگ کا موقف یہ تھا کہ عارضی حکومت کے قیام سے قبل نظریۂ پاکستان اور مسلمانوں کے حق خود ارادیت کو واضح اور غیر مبہم الفاظ میں تسلیم کر لیا جائے اور پوری تفصیلات اختتام جنگ پر زیر بحث لائی جا سکتی ہیں۔ چونکہ حکومت نے اپنی ان تجاویز کو ناقابل ترمیم قرار دیا تھا اس لئے عامۂ مسلم لیگ نے قائداعظم کی قیادت میں ایک طویل اور مسکت قرارداد کے ذریعے ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔

قائداعظم نے ۲۔ اپریل ۱۹۴۲ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس الہ آباد کے خطبہ صدارت میں پوری وضاحت سے ان تجاویز کا تجزیہ کیا اور پھر ۱۳۔ اپریل کو ایک پریس کانفرنس میں مذکورہ تجاویز کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور فرمایا:

> ہم نے تمام تجاویز کو ایک دستاویز کی طرح جانچا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مستقبل کے لحاظ سے اس میں تقسیم (پاکستان) کے اصول کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ تاہم کسی صوبے یا صوبوں کے لئے حق علیحدگی بھی دیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے جو طریقہ بتایا گیا ہے اس کے پیش نظر ہمارا خیال ہے کہ

اسلامی صوبوں میں طریق کار کے متعلق کچھ اس طرح وضع کئے گئے ہیں کہ دس کروڑ مسلمانوں کی قسمت صوبائی مجالس آئین ساز میں چند راؤں سے بندھی رہے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس کے علاوہ نہ پاکستان کو اور نہ مسلمانوں کے حق خود ارادیت کو صاف طور پر تسلیم کیا گیا ہے یہی وجہ تھی کہ ہم نے یہ تجاویز رد کر دیں۔ (قائداعظم محمد علی جناح صـ ۵۶۲)

کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے اپنے اپنے موقف کی روشنی میں کرپس تجاویز کو مسترد کر دیا۔ کرپس مشن کے مقاصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس کی بدولت ایک اہم حقیقت پوری طرح نکھر کر منظر عام پر آگئی کہ پورے ملک کی نمائندگی سے متعلق کانگرس کے بلند بانگ دعووں کا طلسم ٹوٹ چکا ہے اور امریکہ و انگلستان اور دیگر ممالک میں اس کے بے پناہ پروپیگنڈے کی حقیقت پوری دنیا کے سامنے بے نقاب ہو چکی ہے۔ کرپس مشن نے کانگرس کی اشیر باد حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ اس حقیقت سے انکار کی جرأت نہ کر سکا کہ دس کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا قطعی حق اب مسلم لیگ اور صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے اور کانگرس صرف ہندوؤں کی نمائندگی کا حق رکھتی ہے اور وہ بھی سارے ہندوؤں کی نہیں بلکہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی۔ کرپس مشن کی وجہ سے جو دوسرا صدمہ کانگرس کو برداشت کرنا پڑا وہ یہ تھا کہ مبہم الفاظ میں نظریۂ پاکستان کا اعتراف کر لیا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مسلم لیگ قطعی، دوٹوک، واضح اور غیر مبہم الفاظ میں ایسا اعلان چاہتی تھی۔ یہ دونوں صدمے کانگرس کے لئے ناقابل برداشت تھے۔ غم و غصہ کی اس کیفیت میں ان کے لئے اپنے دماغی توازن کو برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔

گاندھی جی نے "ہری جن" میں وطن پاکستان کے خلاف مضامین کی اشاعت شروع کر دی اور پنڈت نہرو نے اپنے واویلا سے دنیا کو متاثر کرنے کے لئے لاسکی کے ذریعے ایک مضمون امریکہ بھیجا جو نیویارک ٹائمز میں شائع ہوا۔ کتنا بڑا فریب تھا جو دنیا کو دیا جا رہا تھا اس کا اندازہ پنڈت جی کے مذکورہ مضمون کے اس اقتباس سے لگائیے۔ وہ فرماتے ہیں :۔

ایک مٹھی بھر لوگوں کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نسلی، تہذیبی اور لسانی قسم کے اختلافات نہیں ہیں آج کل کچھ مسلمان ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس مطالبہ کی عمر مشکل سے چار سال ہے کچھ لوگوں نے اس مسئلہ کو بڑا سنجیدہ مسئلہ بنا رکھا ہے [1]

---

[1] نیویارک ٹائمز - ۱۹ جولائی ۱۹۴۲ء

دس کروڑ انسانوں کی عظیم الشان قوم کی متفقہ آواز کو جس نے فضائے ہند میں زلزلہ طاری کر رکھا تھا "مٹھی بھر لوگوں" کا مطالبہ قرار دینا ہندو کانگرس کے پروپیگنڈے کی پستی کی انتہا ہے۔ کس قدر درست لکھا تھا بیورلی نکلس نے کہ:-

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندو سرمایہ دار اپنی اغراض کی خاطر آخری دم تک پاکستان کے خلاف لڑیں گے وہ دنیا میں خوب شور مچائیں گے اور مادر ہند کے ٹکڑے کئے جانے کے خلاف بھرپور پروپیگنڈہ کریں گے۔ یقیناً ہندو سرمایہ دار روئیں گے چیخ و پکار مچائیں گے۔ دھمکیاں دیں گے۔ رشوت دیں گے اور دنیا کو فریب میں مبتلا کرنے کے لئے ایسے سربر آوردہ ہندوؤں کی خدمات حاصل کریں گے جن کو ہندو قومیت کے جذبے نے واقعات سے اندھا کر رکھا ہے۔ (ورڈکٹ آن انڈیا)

پھر وہ پنڈت جی کے مذکورہ مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

دس کروڑ کی مہیب تعداد کو پنڈت جی نے "کچھ" کے لفظ سے تعبیر کرنا پسند فرمایا ہے۔ معلوم نہیں کیوں؟ "زندگی یا موت" کا عزم رکھنے والی ایک زبردست قوم کے طوفان جذبات کو پنڈت جی یوں ظاہر کرتے ہیں ـــــ "کچھ لوگوں نے اس مسئلہ کو بڑا سنجیدہ مسئلہ بنا رکھا ہے۔"

قارئین کرام! ہم نے آپ کو متنبہ کر دیا ہے۔ باوجود اس شور و شغب اور اس غلط پروپیگنڈے کے اس سلطنت کا نقشہ دنیا کے انصاف پسند حضرات کے ذہنوں میں مرتسم ہو گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ پاکستان پر سخت تنقیدیں کی جائیں گی۔ اس کے خلاف جھوٹ تراشے جائیں گے۔ اس کے بارے میں غلط بیانیوں کا طوفان برپا کیا جائے گا۔ لیکن مجھے یقین واثق ہے کہ پاکستان ان تمام آزمائشوں سے کامیاب ہو کر نکلے گا۔ میں اس بات پر اپنے کامل یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ یہ سلطنت ایک دن ضرور بالضرور وجود میں آئے گی۔ (ایضاً)

قرارداد لاہور کے بعد دو سال کے اندر اندر مسلم لیگ اور قائداعظم دس کروڑ اسلامیان ہند کی واحد نمائندگی کے مقام پر فائز ہو چکے تھے۔ کرپس مشن کی واپسی کے بعد یہ سب کچھ سیاسیات ہند میں ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ بساط سیاست پر کانگرس کے تمام مہرے قائداعظم کے حسن تدبر سے مات کھا چکے تھے اور دوسری طرف حکومت برطانیہ کے کارپردازوں نے اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا کہ اس نازک اور کٹھن مرحلہ پر دس کروڑ مسلمانوں کی منظم قوت کو نظرانداز کرنا ناقابل بیان خطرات کا سامان بن جائے گا۔ چنانچہ ۲- ستمبر ۱۹۴۲ء کو جب کہ کانگرس "ہندوستان چھوڑ دو" کی باغیانہ تحریک کے نام پر (بقول قائداعظم) آخری پانسہ پھینک چکی تھی، وزیراعظم برطانیہ نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ:-

کرپس کی مساعی کو انڈین کانگرس پارٹی نے مسترد کر دیا ہے لیکن اس سے معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ انڈین کانگرس پارٹی تمام ہندوستان کی نمائندہ نہیں ہے۔ وہ پورے ہندو عوام کی بھی نمائندگی نہیں کرتی۔ وہ ایک سیاسی تنظیم ہے جو پارٹی مشین کے ارد گرد تعمیر کی گئی ہے اور جو کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں کے مفاد سے وابستہ ہے۔ اس جماعت سے باہر اور اس سے بنیادی اختلاف رکھنے والے برٹش انڈیا میں نو کروڑ مسلمان ہیں جن کو اپنے خیالات کے اظہار کا پورا حق حاصل ہے

(تقسیم ہند۔ صفحہ ۲۳۸)

آیئے! اب آگے بڑھیں!

کرپس مشن کے بعد

سر سٹیفورڈ کرپس حکومت برطانیہ کے نمائندہ خصوصی بن کر یہاں تشریف لائے تھے ان کا مشن ہندوستان کے لئے ایک تقدیر نو کی سرکاری دعوت تھی۔ چنانچہ ان کی آمد پر ہندو جاتی اور اس کی نمائندہ کانگرس اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئی کہ کانگرسی نیتاؤں کی ملک معظم کی حکومت کے اس ممتاز نمائندے سے دیرینہ راہ و رسم اور مہمان نوازیاں اب رنگ لائیں گی۔ اور آنند بھون میں راز و نیاز کی سہانی چشمکوں کے حاصل مقصود تک پہنچنے کا وقت قریب آگیا ہے۔ چنانچہ سر کرپس کی آمد پر کانگرس نے بھی کے چراغ جلائے اور ہندو جاتی نے خوشی کے شادیانوں سے ان کا سواگت کیا۔ لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

جس دن سر کرپس اپنے مشن کی ناکامی کے بعد ہوا کے دوش پر واپس جا رہے تھے کانگرسی لیڈروں کے چہروں پر مایوسی اور شکست کا غبار چھا رہا تھا۔ قائد اعظم کی گہری فراست نے سازشوں کے ہر جال کو توڑ کر رکھ دیا اور سر کرپس اور ملک معظم کی حکومت دونوں پر واضح کر دیا کہ دس کروڑ مسلمانوں کی قومی آرزوؤں اور امنگوں کی پامالی اور مطالبۂ پاکستان سے گریز کی راہیں اختیار کرنا اب کسی طاقت کے بس کا روگ نہیں رہا۔ اسلامی ہند کے حق خود ارادیت سے انکار و انحراف بدترین نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور ملت اسلامیہ ہر ایسے چیلنج کو مردانہ وار قبول کرے گی جو اس کی تحریک استقلال کے منافی ہو۔

قافلہ آگے بڑھتا ہے۔ اور عزم و یقین اور ذوق سفر کے پورے ساز و سامان کے ساتھ اس کے قدم اپنی منزل پر اٹھ جاتے ہیں۔ یہ منزل اولین مرحلوں سے کہیں بڑھ کر ابتلا و آزمائش کا کڑا سفر ہے۔ یہاں قدم قدم پر نئے خطروں کے آلارم ہوتے ہیں۔ قدم قدم پر سازشوں کے ہمرنگ زمیں دام پھیلائے جاتے ہیں جگہ جگہ وہ نازک موڑ سامنے آتے ہیں کہ اہل کارواں ہراساں ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بارہا یہ اندیشے ابھر کر سامنے آتے ہیں کہ دار ہا کے سامری اور ساحر افرنگ کی مہرہ بازیاں بساط سیاست پر ہم آویزہ ہو کر ملت اسلامیہ کو

مات دینے پر تل گئیں لیکن آنکھ کی جھپک میں نگاہِ مردِ مومن نے سب کچھ بھانپ لیا اور حسنِ فراست سے یہ ساری بساط الٹ کر رکھ دی۔ کرپس مشن کا حسرت ناک انجام اسی حقیقت کا آئینہ دار تھا اور اس سے واضح ہو گیا کہ جب تک مطالبۂ پاکستان کو غیر مبہم، واضح اور دوٹوک الفاظ میں تسلیم نہیں کیا جائے گا ہندوستان کے سیاسی تعطل اور دستوری الجھنوں کا حل نہیں مل سکے گا۔

جواری کا آخری پانسہ

کانگرس نے کرپس مشن سے مطالبہ کیا تھا کہ اپنی سرکاری تجاویز کو بالائے طاق رکھ کر نیشنل گورنمنٹ کے ذریعے تمام اختیارات اسے سونپ دے لیکن قائداعظم کی پرزور دھمکی کی بنا پر سر کرپس ہندو راج کے منصوبے کی تکمیل میں کوئی امداد نہ کر سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ کرپس مشن کی روانگی کے دو ہفتہ بعد آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے کرپس تجاویز کو مسترد کر دیا۔ کانگرس کی مایوسی اور شکست کے زخم اس سے بھی مندمل نہ ہو سکے اور ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو اپنی مجلس عاملہ کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے اس نے اجلاس بمبئی میں برطانیہ کے خلاف "ہندوستان چھوڑ دو" (Quit India) کی مہم چلانے کا فیصلہ کر دیا جنگ عظیم کے نازک ترین مرحلہ پر اس قسم کی مہم کن دور رس اور خطرناک نتائج کا پیش خیمہ بن سکتی تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اس پر بھی غور کیجئے کہ اگر انگریز ان گیدڑ بھبکیوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر تمام اختیارات کانگرس کے سپرد کر دیتا تو اسلامیانِ ہند کا مستقبل کس طرح تیرہ و تار ہو کر رہ جاتا اور ہندو کی غلامی کبھی کر انہیں ابدی موت کی گہری نیند سلا دیتی۔

قائداعظم کا انتباہ

قائداعظم اس مہم کے نتائج و عواقب سے پوری طرح آگاہ تھے اور پوری طرح جانتے تھے کہ اس موقع پر ملت اسلامیہ کی خاموشی کا انجام کیا ہوگا۔ چنانچہ اس مہم کا آغاز ہوتے ہی انہوں نے ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو ایک اخباری اعلان میں فرمایا۔

یہ تسلیم کرنا ممکن نہیں کہ کانگرسی لیڈر اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ یہ مہم نہ صرف تشدد پر منتج ہوگی بلکہ بیگناہ انسانوں کی تباہی اور خوں ریزی پر بھی۔ یہ امر مزید افسوس ناک ہے کہ اس نازک مرحلہ پر یہ تحریک اس لئے شروع کی گئی ہے کہ ان مطالبات کو بزور منوایا جائے جنہیں تسلیم کرنے کا نتیجہ عام مفادات اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کے مطالبات کی قربانی ہوگا۔ میں نے ۱۷ اگست کو آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس بمبئی میں طلب کیا ہے اور پیشتر اس کے کہ عاملہ کوئی فیصلہ کرے میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس تحریک سے کلیتہً الگ رہیں۔ اور کانگرسی کارکنوں کی دھمکیوں اور تخویف سے بے نیاز رہتے ہوئے پُرامن طور پر روزمرہ کے کاروبار میں منہمک رہیں۔

میں کانگرسی کارکنوں کو بھی متنبہ کرتا ہوں کہ اپنے احکام کی بجاآوری کے لئے وہ مسلمانوں کو مرعوب

اور ہراساں کرنے کی کوششوں سے باز رہیں مسلمانوں کو مرعوب اور مجبور کرنے کی کوشش انتہائی تلخ نتائج پیدا کر دے گی اور کانگریسی کارکنوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

(تقاریر و تحریرات جناح۔ جلد اول۔ صفحہ ۴۴۳)

۱۴ ستمبر ۱۹۴۲ء کو نئی دہلی کی ایک عظیم صحافتی کانفرنس میں جہاں برطانیہ، امریکہ، چین اور ہندوستان کے ممتاز اخبارات کے نمائندے موجود تھے قائداعظم نے صورت حالات کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مسٹر گاندھی کی یہ مہم جواری کا آخری پانسہ ہے۔ آپ کو مسلم لیگ سے کیا توقع تھی؟ کیا آپ کو امید تھی کہ کانگرس کے اس داؤ پیچ سے واقف ہونے کے بعد مسلم لیگ اس تحریک سول نافرمانی کی تائید کرتی؟ یہ محض برطانیہ ہی کے خلاف اعلان جنگ نہیں بلکہ کانگرسی مطالبات کے لحاظ سے یہ ایک خانہ جنگی ہے۔ کیونکہ اس کے مطالبات مفاد اسلامی کے منافی ہیں۔ اگر آزادی اور خود مختاری کے نام پر مسلمان بھی اس تحریک میں شامل ہو جاتے تو مسٹر گاندھی انگلستان، امریکہ اور ساری دنیا سے کہتے پھرتے کہ وہی سارے ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور یہ کہ ان کے مطالبات کو مسلم ہندوستان کی تائید بھی حاصل ہے۔ اگر مسلمان اس دام تزویر میں آجاتے تو یہ ان کی سب سے بڑی غلطی ہوتی۔

اگر ہمیں انگریزوں کی دیانت داری پر بھروسہ ہوتا تو قدرتی طور پر ہمارے لئے ایک ہی راستہ رہ جاتا کہ ہم ان کے ساتھ مل کر اس تحریک کو کچل دیں کیونکہ اس تحریک کے مقاصد میں ہماری پامالی بھی شامل تھی لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ہم انگریزوں پر بھی اعتماد نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے داؤں پیچ میں۔ اس لئے ہم نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ اس معاملہ سے بالکل علیحدہ رہیں۔ ان کو آپس میں لڑنے دو۔ یہ انہیں واقعات میں سے ایک ہے جبکہ غیر جانبداری ہی بہترین حکمت عملی ہوتی ہے۔ (قائداعظم محمد جناح صفحہ ۵۷۵)

اس کانفرنس میں قائداعظم نے حکومت برطانیہ پر واضح کیا کہ

فرض کیجئے کہ برطانوی حکمت عملی کے خلاف مارے غصے کے میں کل یہ کہہ دوں کہ "حکومت سے عدم تعاون کرو" تو یقین کیجئے کہ حکومت آج کل جس قدر مصیبت (کانگرس کے ہاتھوں) بھگت رہی ہے اس سے کم از کم پانچ سو گنا زیادہ اس کو ہمارے ہاتھوں سے بھگتنی پڑے گی۔ یہ بندوق اور تلوار کی بات نہیں مسلمان کا مزاج اور طرز تربیت ہی کچھ ایسا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۷۴)

قائداعظم سے سوال کیا گیا کہ حکومت برطانیہ کے خلاف اگر مسلم لیگ نے ایسا اقدام کیا تو کیا ملک کی افواج اور سرحدات و اسلامی ممالک کے مسلمان بھی اس سے متاثر ہوں گے؟ اس اہم اور نازک سوال کا جواب دیتے ہوئے

قائداعظم نے فرمایا

میں خوں فشانی کی ان تفاصیل میں جانا نہیں چاہتا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ میرا فوج سے کوئی رابطہ نہیں لیکن مجھے احساس ہے کہ ایسی حالت میں جب کہ پچاس فی صدی فوج مسلمانوں پر مشتمل ہے مسلم لیگ کا اقدام فوج کے ایک عظیم حصہ پر اثر انداز ہوگا۔ علاوہ بریں سرحدی علاقوں میں بھی ایک آگ سی بھڑک اٹھے گی اور جہاں تک افغانستان، ایران، عراق، ترکی اور مصر جیسے مسلم ممالک کی اخباری اطلاعات کا مجھے اندازہ ہے انہیں مسلمانان ہند کے مطالبات سے پوری ہمدردی ہے۔ وہاں کے اخبارات بھی مطالبۂ پاکستان کی پرزور تائید کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے مجھے یقین ہے کہ اگر مسلمانوں اور برطانوی حکومت میں لڑائی چھڑ گئی تو وہ لازماً اس سے متاثر ہوں گے۔

کانگرسی مہم کا حسرت ناک انجام

گاندھی جی اور ان کی کانگرس نے بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ حکومت کے خلاف سول نافرمانی اور بغاوت کا اعلان کیا تھا۔ اس سے قبل انگریزیت کے خلاف ہر ملکی تحریک میں مسلمان نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر مقدمۃ الجیش کی طرح اندھا دھند آگے بڑھتے رہے تھے۔ اپنی طبعی گرم جوشیوں سے وہ ہر تحریک میں شریک ہوئے اور ایوان حکومت میں زلزلے طاری کر دیئے۔ کانگرس کا خیال تھا کہ مسلمان اب بھی اپنے فطری جوش سے دیوانہ وار آگے بڑھیں گے۔ اور مسٹر جناح ایک یوسف بے کارواں کی طرح تن تنہا کھڑے رہ جائیں گے لیکن اب مسلمانوں کی آنکھیں کھل چکی تھیں قائداعظم کی قیادت نے انہیں یہ نکتہ پوری طرح سمجھا دیا تھا کہ اس جوش میں انہوں نے بہت کچھ کھو دیا اور اب وقت آ گیا ہے کہ آزادی و حریت کے یہ دیوانے جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا سیکھیں۔ سیاسیات کے طوفانوں میں اب انہوں نے پہلی بار خودنگری اور خودگری کے اصولوں کو اپنایا تھا۔ اسی احساس خودی نے ان پر یہ حقیقت بے نقاب کر دی تھی کہ آزادی کے نام پر کانگرس کی یہ مہم درحقیقت ملت اسلامیہ ہندیہ کے حق خودارادیت کو پامال کرنے کا خطرہ ہے۔ اس لئے قائداعظم کی ہدایت پر لبیک کہتے ہوئے وہ کانگرس کی تحریک سے کلیتہً الگ رہے انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ انگریز اور ہندو کی اس پرفریب لڑائی میں غیر جانبداری کی حکمت عملی ہی ان کے لئے سلامتی کی راہ ہے۔ چنانچہ ان کی علیحدگی کا نتیجہ تھا کہ جس مہم کے لئے بڑے کروفر سے پہلا قدم اٹھا تھا وہ چند ہی دنوں میں گرد راہ بن کر رہ گئی۔ کانگرس ہائی کمان کے لیڈر فی الفور گرفتار کر لئے گئے اور اس کے ساتھ "بھاڑ جھونک" کے چند رسمی واقعات کے بعد کانگرس اور ہندوؤں کا سارا جوش و خروش قبرستان کی سی خاموشی میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ کانگرس کی پوری تاریخ کی شاید یہ بدترین شکست تھی اور یہ اس بنا پر اسے نصیب ہوئی کہ اس کی مہابھائی ذہنیت نے اسلامیان ہند کا اعتماد کھو دیا